آنند نرائن مُلّا

[شاعر اور دانش ور]

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

اشاعت : ———— ۱۹۹۵ء
قیمت : ———— چالیس روپے
طباعت : ———— عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

ترتیب و تزئین : شاھد ماھلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲

فہرست

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو گذشتہ پچیس سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا ہے، اس کے علمی و ادبی کام کی جہت بھی مخصوص ہے' اس کے کام کا محور غالب اور عہدِ غالب ہے۔ چنانچہ اپنے اس محدود دائرے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں فراخدلی سے اعتراف ہوا ہے، اسی حوصلہ افزائی کی وجہ سے اراکینِ ادارہ، انسٹی ٹیوٹ کی "سلور جوبلی" منانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

جہاں اس انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام علمی و تحقیقی کارنامے انجام پذیر ہوتے ہیں وہیں اردو کے بزرگ شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور محققوں کی تجلیل و بزرگداشت کی مناسبت سے جشن ہوتا ہے، یہ جلسے اکثر انھیں حضرات کی قیام گاہ پر منعقد ہوتے ہیں تاکہ انھیں سفر کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ قاضی عبدالودود کے لیے جلسہ پٹنہ میں ہوا اور میکش اکبرآبادی کے لیے آگرہ میں، آخری بار جناب مالک رام کی تجلیل کا جلسہ نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دولت کدہ پر ہوا، ہمارے صدرِ جمہوریہ اس وقت نائب صدر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، انھوں نے مہمانوں کی بڑی عزت و تکریم اور ہماری بڑی ہمت افزائی کی، اس موقع پر مالک رام صاحب نے رسول اللہ صلعم کی سیرت کے ایک مخصوص پہلو پر نہایت موثر اور بصیرت افروز تقریر کی تھی جس کی یاد ہنوز تازہ ہے، کاش کہ وہ تقریر رکارڈ کی جا سکتی۔

گذشتہ سال انسٹی ٹیوٹ نے فیصلہ کیا کہ اردو کے محترم اور سب سے بزرگ شاعر جناب آنند نرائن ملّا کے احترام میں ایک جشن کیا جائے۔ جشن کے سلسلے میں ہمارا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ جب کسی بزرگ شخصیت کی تجلیل و توقیر کے سلسلے میں جشن ہوتا ہے تو ہم ان کے دوستوں اور مخلصوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ان بزرگ کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات یا ان کے فن کے تعلق سے کوئی مختصر سا مقالہ عنایت فرمائیں، یہ تحریریں بطور یادگار ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کردی جاتی ہیں۔ ملّا صاحب پر جشن کرنے کے فیصلے کے فوراً بعد ہم نے ان کے دوستوں سے مضمون کی فرمائش کی، لیکن مضامین کی فراہمی میں کافی تاخیر ہوگئی، ورنہ خیال یہی تھا کہ یہ جلسہ سالِ گذشتہ ہی انجام پذیر ہو جائے گا۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ہماری دعوت پر ملّا صاحب کے دوستوں نے نہ صرف تاثراتی مضامین لکھے بلکہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھرپور مقالے سپردِ قلم کیے اور ہمیں ان کے یکجا شائع کرنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے۔

ملّا صاحب لکھنوی تہذیب کے پروردہ ہیں، ان کی شخصیت، ان کے فن، ان کی شاعری پر لکھنوی زندگی کی گہری چھاپ ہے، وہ لکھنؤ سے دلّی آگئے لیکن وہ لکھنؤ کو بھولے نہیں، اور بھولتے کیوں کر، لکھنؤ تو ان کی زندگی اور شخصیت کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔

ملّا صاحب شاعری میں کیا درجہ رکھتے ہیں، وہ کس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی شاعری کے محرکات کیا ہیں، اس طرح کے سارے امور کا احاطہ ان کے دوستوں کے مقالے میں ہو چکا ہے اور ملّا صاحب کے یہ مخلصین ایسے ہیں جو ان کی صحبت میں مدّتوں رہے ہیں اور جنھوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اردو کے عظیم نقّاد سیّد احتشام حسین ان کے عزیز دوستوں میں تھے، افسوس وہ ہم میں نہیں ورنہ ملّا صاحب کے جشن میں اہم رول ادا کرتے۔ یہ مختصر سی کتاب جو اس جشن کے موقع پر شائع ہو رہی ہے، ان حضرات کے لیے جو ملّا صاحب کی شخصیت اور اُن کے فن کو جاننا چاہتے ہیں، ایک گراں قدر تحفہ ہے جو اُن کے دوستوں کی طرف

سے بطور ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ملّا صاحب کی شاعری کی نسبت سے صرف ایک بات کہنا چاہوں گا، اُن کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

خونِ شہید سے بھی قیمت میں سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

ملّا صاحب کو یہ شعر بہت پسند ہے، چنانچہ ان کی کتاب کا نام بھی "سیاہی کی ایک بوند" ہے۔ اس کتاب کی رسمِ اجرا محترمہ اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہند جو ہمارے ادارے کی صدر رہ چکی ہیں، ان کے دستِ مبارک سے عمل میں آئی۔ ملّا صاحب کے ایک قریبی دوست نے لکھا ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی کے حسبِ ذیل شعر کی موجودگی میں ملّا صاحب کے شعر کی ضرورت نہ تھی ؎

بخدا اعظیم تر ہے شہدا کے بھی لہو سے
میرے سینۂ قلم میں جو بھری ہے روشنائی

میری حقیر رائے میں ملّا صاحب کے شعر کی بہر حال ضرورت ہے، اُن کے شعر کی سادگی، برجستگی اور الفاظ کے دروبست نے شعر کو بڑا پُر تاثیر بنا دیا، اس وجہ سے یہ شعر دادِ سخن کا طالب ہے۔ اگرچہ بادی النّظر میں ملّا صاحب کے شعر کو جوشؔ کے شعر کا چربہ کہا جائے گا، لیکن بخوبی ممکن ہے کہ انھوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی وہ حدیث سُنی ہو جس میں علم کی فضیلت کا ذکر اس تمثیل کے ساتھ ہے کہ عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے کہیں افضل ہے، یہ حدیث امام غزالی کی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء علوم الدّین" کے بابِ اوّل میں جلی انداز میں مندرج ہے، اگر جوشؔ ملیح آبادی اور ملّا صاحب کے علم میں یہ حدیث نہ تھی تو یہ توارد مضمون کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ملّا صاحب سے میرا ذاتی لگاؤ ہے اس لیے کہ میری تعلیمی زندگی کا آغاز لکھنؤ میں ہوا، لکھنؤ یونیورسٹی ہی میں، میں نے اپنی دانش گاہی تعلیم کی تکمیل کی اور اسی یونیورسٹی میں تدریسی خدمت پر مامور بھی ہوا، اور مجھے فخر

محسوس ہو رہا ہے کہ ملّا صاحب کے دو مخلص دوست یعنی پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر سیّد احتشام حسین میرے محسن اور میں ان کا رفیقِ کار تھا۔ اسی وجہ سے بلاواسطہ تو بہت کم اور بالواسطہ تو اُن کی صحبتوں سے لطف اندوز ہونے کا بار بار موقع ملا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں ملّا صاحب کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا اُن کو تا دیر زندہ اور سلامت رکھے :

ایں دعا از من و زجملہ جہاں آمین باد

نذیر احمد
(نائب چیئرمین غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلّی)

ڈاکٹر خلیق انجم

آنند نرائن ملا: ترانوے سال کے نوجوان

پنڈت آنند نرائن ملا بیسویں صدی کے اردو کے ممتاز ترین شاعر اور نثر نگار ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے قانون داں ہیں اور ملک کے مایۂ ناز قانون دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

ملا صاحب ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں رانی کٹرہ (لکھنؤ) میں واقع اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق ایک کشمیری پنڈت خاندان سے ہے۔ ان کے والد جگت نرائن ملا صاحب لکھنؤ کے ممتاز اور مشہور ایڈوکیٹ تھے۔

ملا صاحب کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں امتیازی نمبروں سے انگلش میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے کے بعد انھوں نے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۵ء میں یہ امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ملا صاحب نے جب انگریزی میں شعر و شاعری شروع کی تو وہ ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے اردو میں پہلی انگریزی نظم کہی۔ جب نظم چھپی تو اردو کی ممتاز شخصیتوں نے اس نظم کی بہت تعریف کی جس سے ملا صاحب کی اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ انھوں نے اردو میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے خاصی تعداد میں اعلا درجے کی نظمیں کہہ لیں۔ والد چاہتے تھے کہ ملا صاحب وکالت کا پیشہ اختیار کریں۔ لیکن

ان کی شاعری میں اتنی جان تھی کہ اردو کے ممتاز ترین شاعروں اور نقّادوں کو اُن سے بہت سی امیدیں وابستہ ہوگئی تھیں۔ اردو کے صفِ اوّل کے شاعر جگرؔ مرادآبادی ملّا صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے ملّا صاحب کے والد سے کہا کہ :

"آپ اس نوجوان کو عدالت میں نہ لے جائیں، مجھے دے دیجیے۔
اردو ادب کا یہ بیش قیمت سرمایہ ہے، عدالت میں ضائع
ہو جائے گا۔"

جگرؔ صاحب کا خیال تھا کہ قانونی پیشہ ملّا صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کو تباہ کر دے گا۔ ملّا صاحب کے والد نے جگرؔ مرادآبادی کی یہ بات نہیں مانی اور والد کی خواہش کے مطابق ملّا صاحب نے وکالت شروع کر دی۔ اپنی ذہانت، علمی استعداد اور شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے کچھ ہی دن میں انھوں نے دونوں ہی میدانوں میں اپنے لیے ممتاز مقام پیدا کر لیا۔ ملّا صاحب نے تقریباً تیس سال تک وکالت کی۔ ۱۹۵۴ء میں وہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے ملّا صاحب کا عقیدہ ہے کہ وہ شاعر جو ایک انسان کے مصائب و آلام کو نظر انداز کر کے خوشی و سرمستی کے ترانے سناتا ہے، کبھی بڑی شاعری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس شاعر میں انسانی جذبہ اور انسانی ہمدردی نہیں ہوگی وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے نے قانون اور انصاف کے میدان میں بھی اُن کی بڑی مدد کی۔ جج کی حیثیت سے جب کبھی وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے تو وہ انسانی قدروں کو فراموش نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ بہت کامیاب جج ثابت ہوئے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سبکدوشی کے وقت انھوں نے پولس کے بارے میں جو اظہارِ خیال کیا تھا وہ ہندوستانی قانون کی زندگی میں یادگار الفاظ ہیں اور اکثر موقعوں پر ان کو دُہرایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا :

"جج کی حیثیت سے ملازمت کے دوران میں نے بہت سے
ڈاکو اور جرائم پیشہ افراد کو دیکھا ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ ہندوستانی
پولس سے بڑھ کر کوئی ڈاکو اور جرائم پیشہ نہیں ہو سکتا"

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ملّا صاحب دہلی آ گئے اور یہاں انھوں نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں وکالت شروع کردی۔ آج کل ملّا صاحب ایک فوجداری وکیل کی حیثیت سے بہت مقبول اور ممتاز وکیل ہیں۔ خاص طور سے قتل کے مقدمات میں ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

ملا صاحب نے ۱۹۱۷ء میں شعر و شاعری کا آغاز کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ان کی ابتدائی نظمیں انگریزی میں ہیں۔ ملا صاحب نے اقبال کی نظم "لالۂ طور" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اب تک ملّا صاحب کے چھ مجموعۂ کلام اور دو مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کے نام ہیں:

شاعری:

۱: "جوئے شیر" نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۹ء
۲: "کچھ ذرّے کچھ تارے" انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۹ء
۳: "میری حدیث عمر گریزاں" انڈین پریس پرائیویٹ لمیٹڈ الٰہ آباد، ۱۹۶۳ء
۴: "سیاہی کی ایک بوند" نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۲ء
۵: "کربِ آگہی" مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء
۶: "جادۂ ملّا" انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۸۸ء

نثر:

۱: "کچھ نثر میں بھی" مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

ترجمہ:

۱: "مضامینِ نہرو" انڈین پریس پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۳۹ء۔

ملّا صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو

"مضامینِ نہرو" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ "مضامینِ نہرو" کا آخری اڈیشن کچھ عرصے پہلے دہلی اردو اکیڈمی نے شائع کیا تھا۔ فروغِ وسائلِ انسانی کے وزیر جناب ارجن سنگھ نے ملّا صاحب کی کوٹھی ہی پر اس کتاب کی رونمائی کی تھی۔ ملّا صاحب نے چکبست پر مختلف ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ "یادگارِ چکبست" کے نام سے مرتّب کیا تھا جو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اردو کے نقّادوں اور ادبی تنظیموں نے ملّا صاحب کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے صفِ اوّل کے نقّادوں نے ملّا صاحب کی شاعری اور نثر پر مضامین لکھے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے ملّا صاحب کی شخصیت اور فن پر ایک کل ہند سیمنار کیا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے نقّادوں نے ملّا صاحب کی شخصیت اور فن پر مضامین پڑھے تھے۔ سیمنار کے یہ مضامین انجمن نے کتابی صورت میں شائع کر دیے ہیں۔

بہت سی ادبی تنظیموں نے ملّا صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں انعامات سے نوازا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں یو۔پی گورنمنٹ نے ملّا صاحب کی خدمت میں غالب ایوارڈ پیش کیا۔ یہ ایوارڈ ملّا صاحب اور فراق گورکھپوری کو مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ملّا صاحب کی کتاب "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" پر ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا۔ ۱۹۸۰ء میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ملّا صاحب کی خدمت میں ذوق ایوارڈ پیش کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں ملّا صاحب کی خدمت میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے "ایٹلس غالب ایوارڈ" پیش کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ملّا صاحب کو فخرالدین علی احمد ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ملّا صاحب مختلف حیثیتوں میں بہت سی ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں۔

- ۱۹۶۹ء میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر منتخب ہوئے اور پانچ سال کے بعد یعنی ۱۹۷۴ء میں صدر کی حیثیت سے اُن کا پھر انتخاب ہوا۔ یہ مدّت ختم ہونے کے بعد بھی انجمن کے تمام اراکین چاہتے تھے کہ ملّا صاحب صدر کی حیثیت سے انجمن سے وابستہ رہیں۔ لیکن اپنی

مصروفیات کی وجہ سے ملّا صاحب نے معذرت کر لی۔ انجمن کی صدارت کے دس سال کے عرصے میں ملّا صاحب نے اردو تحریک کی اس انداز سے نمائندگی کی کہ وہ اردو تحریک کا اہم حصّہ بن گیا ہے۔ جے پور کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے ملّا صاحب نے کہا تھا :

"اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں اپنی مادری زبان نہیں۔"

ان کے یہ الفاظ اردو زبان کے جگمگاتے ہوئے سیکولر کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ملّا صاحب ساہتیہ اکیڈمی کی مشاورتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں وہ ساہتیہ اکیڈمی کی مشاورتی کمیٹی کے دوبارہ رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں ملّا صاحب ترقی اردو بورڈ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

ملّا صاحب عملی سیاست داں کبھی نہیں رہے۔ لیکن انھیں کانگریس سے ہمیشہ دلی لگاؤ رہا اور آج بھی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ کانگریس کے امیدوار کی حیثیت سے لکھنؤ سے لوک سبھا کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ لوک سبھا کے رکن کی حیثیت سے اُن کی خدمات کو بہت سراہا گیا اور اسی لیے جب ان کی لوک سبھا کی رکنیت ختم ہوئی تو کانگریس نے انھیں ۱۹۷۲ء میں راجیہ سبھا کا ممبر منتخب کرا دیا۔ ملّا صاحب بہت سے سرکاری کمیشنوں اور کمیٹیوں کے صدر بھی رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جیل ریفارم کمیٹی کے صدر رہے۔ طویل عرصے بعد وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے قانونی شعبے کے چیئرمین رہے۔

ملّا صاحب کی شاعری کا بڑا حصّہ محض جذبے اور احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک دردمند دل رکھنے والے دانشور کا فکری اظہار بھی ہے۔ وہ ایسی دنیا اور ایک ایسے سماجی نظام کے متلاشی ہیں، جس میں انسان سکون اور آرام کی زندگی گزار سکے جہاں اس کا جسم اور دماغ کسی طاقت، ظلم، جبر اور استبداد کا شکار نہ ہو اور جہاں اس کے فکر، احساس اور اس کے اظہار کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ ملّا صاحب نے ایک خطبے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: " تاریخِ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ روزِ آفرینش سے

لے کر آج تک طفلِ انساں نے ہمیشہ ایک ایسے نظامِ ہستی کے خواب دیکھے، جس میں وہ اپنے شوق کی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکے۔ اس کا اپنا گھر ہو، جہاں وہ اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ جب کارِ دنیا سے فرصت پائے تو کچھ لمحات سکون اور آرام کے ساتھ گزارے۔ اس کے جسم کو کسی جبر کے شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے، اسے امن اور محبّت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لے کر اپنے پورے انسانی قد تک پہنچنے کا موقع ملے۔ جہاں افسروں کی نہیں بلکہ قانون کی حکومت ہو جہاں اسے الزامات کے خلاف اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بے روک ٹوک پورا پورا اختیار دیا جائے اور جہاں آزادی، مساوات اور اخوت کے نعروں میں نہیں بلکہ نغمات کی لے میں مذہب و ملّت، رنگ و نسل اور جنس و ذات کے سارے امتیازات، اختلافات اور تفرقے ایک نالۂ بے آواز بن کر فنا ہو جائیں۔"

("کچھ نثر میں بھی" ص ۱۷-۱۸) ملّا صاحب نے اپنی نظم "گمراہ مسافر" میں انسان کے اسی کرب کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے:

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیّاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا
اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پسِ دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا
دولت کا مغنی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آ کر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں

لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیمِ مساوی کے حامی پھرتے کے بڑھے میزان اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلّا نہ ملا
کچھ کیمیا گر پھر ذرّوں کا دل چیر کے لائے آگ نئی
شعلوں کی خدائی ہاتھ آئی شبنم کا مگر قطرا نہ ملا
بے چاری الفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
ار پھر کے وہیں پہ آتا ہے انساں ہے رہ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

انسان کے دکھ درد کا بھرپور احساس اور انتہائی موثر انداز میں اس کا اظہار ملّا صاحب کی آواز کو انفرادیت بخشتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے ملّا صاحب کی شاعری کے اس منفرد انداز پر گفتگو کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا تھا: "ان کے صاف، شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصوّر سے خون ہو جانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔" یہ ان کا ایسا انفرادی رنگ ہے جسے انھوں نے شاعرانہ، مترنم اور دل کش زبان میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے نکلیں گے۔

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

طالب امن ہیں سب بزم میں لیکن ہر رند
لے کے اک ہاتھ میں تیغ، ایک میں جام آتا ہے

معبدِ انساں بنے کیسے یہ فقط ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو، میرے ہی بُت خانے کا نام

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

ملّا صاحب کی مصروف اور فعّال زندگی دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترانوے سال کے نوجوان ہیں۔ خدا انھیں ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے۔ آمین !

پروفیسر آلِ احمد سرور

آنند نرائن ملّا

رند وہ جس سے میکدہ کو شرف پھول جو آبروئے گلشن ہے
(سرور)

تہذیب، شائستگی، انسانیت، شرافت، خلوص، مروّت، مشرقیت کے ساتھ ایک آفاقیت اگر یکجا دیکھنا ہو تو آنند نرائن ملّا کو دیکھ لیجیے۔ اس وقت ان کی عمر ترانوے سال کی ہے (تاریخِ پیدائش ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء)۔ مگر ان سے ملیے تو اقبالؔ کا یہ مصرع ضرور یاد آئے گا ؎

جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

میں نے سب سے پہلے انھیں ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں اودھ جم خانہ کے ایک ٹینس میچ میں دیکھا۔ وہ شاید کلب کے سکریٹری تھے۔ غوث محمد خاں اور ایک چک کھلاڑی پُن چیک PUNCHEC کا کانٹے کا میچ ہو رہا تھا۔ ایک نہایت دیدہ زیب وجاہہ زیب شخص کو سوٹ میں ملبوس دیکھا۔ دریافت کیا تو کسی نے ملّا صاحب کا نام بتایا۔ ان کا کلام رسالوں میں پڑھا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ چکبستؔ کی جگہ اب انھوں نے لی ہے۔

جب اگست ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا تقرر اردو کے ریڈر کی جگہ پر ہوا تو چند روز بعد کافی ہاؤس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ربط ضبط بڑھا اور یہ عالم ہو گیا کہ ایک

دن بھی ایسا نہ ہوتا کہ ہم لوگ ملتے نہ ہوں۔ کسی نہ کسی ادبی اجتماع میں یا کافی ہاؤس میں یا گھر پر۔ ملّا صاحب لکھنؤ کے ممتاز وکیل تھے مگر اس زمانہ میں فوجیوں کے ایک پینشن ٹریبونل کے جج ہو گئے تھے۔ دفتر میں کام زیادہ نہ تھا۔ بلا ناغہ یا تو دفتر سے جاتے وقت یا واپسی میں شام کو، میری قیام گاہ ۷، بیرو روڈ پر آ جاتے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جو جلسے اتوار کو میرے یہاں ہوتے تھے اُن میں بھی ملّا صاحب کئی سال تک آئے لیکن ۱۹۴۸ء میں جب ترقی پسند مصنّفین کے مسلک میں کچھ "وہابیت" آئی تو ملّا صاحب کا آنا بھی کم ہو گیا اگرچہ ان مصنّفین سے ان کے ذاتی تعلّقات ویسے ہی رہے۔

ملّا صاحب کے پہلے مجموعے "جوئے شیر" پر مقدّمہ میں نے لکھا تھا۔ یاد آتا ہے کہ کٹّر کمیونسٹوں کے حلقے میں اس چیز کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ملّا صاحب کانگریس سے قریب تھے اور کمیونسٹ اس وقت کانگریس کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ میری ایک دوست ڈاکٹر رشید جہاں سے اس سلسلہ میں خاصی بحث بھی ہوئی تھی۔ یاد آتا ہے کہ "جوئے شیر" میں ملّا صاحب نے یہ قطعہ بھی لکھا تھا۔ ؏

یہ حادثہ سال چہل و نہ میں ہوا — ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے ادیبوں میں جو مقتول ہوئے — ملّا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

ملّا صاحب نے جس فضا میں آنکھ کھولی اس میں اردو کا دور دورہ تھا۔ اُن کے والد پنڈت جگت نرائن ملّا لکھنؤ کے ایک ممتاز وکیل تھے کچھ عرصے تک لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے۔ اُن کے ایک بھائی نے مسلم لا پر جو کتاب لکھی ہے جو وہ آج تک مستند سمجھی جاتی ہے۔ بچپن میں ملّا صاحب کو اردو اور پھر فارسی پڑھائی گئی۔ انھوں نے شاید مولوی برکت اللہ فرنگی محلی سے فارسی پڑھی تھی۔ بعد میں ان کے بھائی مولوی عظمت اللہ غازی پوری کے وکٹوریا اسکول میں میرے اردو کے استاد رہے۔ ملّا صاحب کو ان کی ماں نے جو لوریاں سنائیں وہ اردو کی لوریاں تھیں۔ ان کا یہ شعر ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ؏

لب مادر نے ملّا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

ملّا صاحب کا خاندان کشمیری پنڈتوں کا خاندان ہے۔ غالباً انیسویں صدی میں یہ لکھنؤ آیا۔ دراصل ان کی گوت مَلّا (فتحہ سے) ہے۔ مَلّا غالباً ملاح ہو گا لیکن ان کے والد اور بھائی مُلّا لکھتے تھے اور یہی آواز آنند نرائن ملّا نے اختیار کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور یہیں سے قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔ شروع میں وہ انگریزی میں شعر کہا کرتے تھے۔ پنڈت منوہر لال زتشی سے خاصے قریب تھے۔ انھیں کی فرمائش پر پیامِ مشرق کے ان قطعات کا جو لالۂ طور کے عنوان سے چھپے ہیں، فارسی سے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ترجمے کی کافی تعریف ہوئی تھی۔ اس عنوان سے "پیامِ مشرق" میں ۱۶۳ قطعات ہیں، ان میں سے باسٹھ قطعات کا انگریزی ترجمہ کچھ عرصہ ہوا انڈین لٹریچر (ساہتیہ اکادمی) شمارہ ۱۳۶ مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ چند قطعات مع ترجمہ پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) شہید ناز او بزم وجود است — نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب — بسیمائے سحر داغ سجود است

The world is stricken by His gharm and grace.
The past and present sing His Beauty's praise.
Each mornning in the sliver court of dawn
The sun, in glowing terms, his homage pays.

(۲) بہ برگ لالہ رنگ آمیزیِ عشق — بجان ما بلا انگیزیِ عشق
اگر این خاکدان را واشگافی — درونش بنگری خونریزیِ عشق

The tint of love, the face of tulip paints
And in our soals, its fire and tumult reigns
If you just pierce the heart of Earth, you will find
Blood spilt by love out pouring from its veins.

(۳) دِلا نارائیِ پروانہ تا کے — نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکی خود را بسوزِ خویشتن سوز — طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے

How long shalt thou remain in mortal fright
Moth like — O heart make up thy mind to fight
Once burn thy self with thine own inner fire
How long shalt thou persue an alien light.

(۴) تنے پیدا کن از مشت غبارے — تنے محکم تر از سنگین حصارے
درون او، دلِ دردآشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

From thy frail dust a massive body forms
As hard as rock to face the fiercest stroms
Within a heart that knows the pangs of pain
A rivulet singing in mountains arms

(۵) سحر در شاخسارِ بوستانے — چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری — سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

This morning the night ingale in ecstasy
was singing from the branches of a tree,
Bring out whatever lies, burried in they heart
A tear, a sigh, a cry, a melody.

(۶) نہ پیوستم دریں بستان سرا دل — ز بند این و آن آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند — گلان را آب و رنگے دادہ رفتم

I did not in this garden, lose my heart
I kept myself aloof from every tie
I roamed some moments like the morning breeze,
Gave colour to the flowers and then bade them good bye.

(۷) گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور — کہ جان تو ز خود نامحرمے ہست

قدم در جستجوئے آدمی زن   خدا هم در تلاش آدمی هست

In search of vision — thou to sinai ran
A while theme own live features try to scan
Perhaps thou knowest not the hidden truth
God still is waiting in the quest of man.

(۸) میا را بزم بر ساحل که آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز   حیات جاودان اندر ستیز است

Come, sit not idly on the distant shore
Where life's tune is but faintly wafted over
Plunge in the waves, for in their music less
The secret of the Seas' eternal roar.

(۹) خیالم کو گل از فردوس چیند   جو مضمونِ غریبے آفریند
دلم در سینه می لرزد چو برگے   که بروے قطرهٔ شبنم نشیند

My heart which picks its flowers from paradise
When'ver tis thrilled by some emotions new
My being trembles like a petal frail
Upon which lightly falls a drop of dew

(۱۰) مرا ذوقِ سخن خون در جگر کرد   غبار راه را مشت شرر کرد
بگفتار محبت لب کشودم   بیان این راز را پوشیده تر کرد

My fancy turned my soaring thoughts to verse
within my heart some glowing truths, I nurse
I op'ed my lips to a sing of loves life
my exposition made the secret worse

ملّا صاحب کے کلام کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "جوئے شیر" ہے، دوسرا "کچھ ذرّے کچھ تارے" تیسرا "میری حدیث عمر گریزاں" اور چوتھا "سیاہی کی ایک بوند"۔ نثر میں "مضامینِ نہرو" کا اردو ترجمہ قابلِ ذکر ہے۔ اس کے دو اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا اڈیشن دہلی اردو اکیڈمی نے دو سال ہوئے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ "جادۂ ملّا" اور مختلف موقعوں پر کچھ خطبات و مقالات بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کل ہند کانفرنس منعقدہ جے پور میں ان کا خطبۂ صدارت اور فخر الدّین میموریل لکچر، دونوں اپنی شُستہ اور شفاف نثر کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں۔ "میری حدیث عمر گریزاں" کے دیباچے میں انھوں نے اپنی شاعری اور ادبی نظریات کے متعلق کافی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اس کے مطالعے کے بعد ملّا کی شاعری کی تفہیم، تحسین اور تنقید آسان ہو جاتی ہے۔ شاعری ان کے نزدیک شیریں، دیوانگی نہیں، مقدس سنجیدگی ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ "فن کار کا قد اس کے انسانی قد سے اونچا نہیں ہو سکتا۔" وہ شاعر کو صرف فن کار نہیں دانائے راز اور پیمبر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوعِ انسان سے بے پناہ محبّت کے بغیر عظیم نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ادبِ عالیہ پیش کر سکتا ہے۔ ملّا ٹالسٹائی کے ہمنوا ہیں جو یہ کہتا ہے کہ "انتہائی جمالیاتی کیف ہمیں کبھی پوری آسودگی نہیں بخشتا۔ ایک دردمند انسان اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ مکمّل آسودگی صرف اس ادب سے پاتا ہے جو صالح ہو اور انسان کے اخلاق کو بلند کرے۔" ملّا صاحب کا یہ جملہ رشید احمد صدیقی کے اس قول کی یاد دلاتا ہے کہ "اچھا شاعر اچھا انسان ہوتا ہے۔" ملّا صاحب کے قول اور رشید صاحب کے قول، دونوں کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ نکتہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سب کچھ اخلاق کی تعبیر اور اچھے کے مفہوم پر منحصر ہے۔ بہر حال ملّا نے اپنی بات وضاحت سے کہہ دی ہے۔ اور اس لیے وہ حقیقت نگاری کے بجائے زندگی کے راز سے پردہ اُٹھانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ داخلیت و خارجیت میں بھی توازن کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک داخلیت اس وقت تک حسن ہے جب تک اس کے رشتے خارجیت سے استوار نہیں۔ ان کے نزدیک آپ بیتی میں جان اسی وقت آتی ہے جب اس میں جگ بیتی بننے کی صلاحیت

ہو۔ ملا صاحب کا یہ خیال کچھ لوگوں کو چونکائے گا کہ عشقیہ شاعری انسانی شاعری سے کمتر ہے۔ یہاں شاید ان کی مراد صرف اس عشقیہ شاعری سے ہے جو دو جسموں کی واردات کے گرد گھومتی ہے ورنہ تصوّف میں جو عشق کا مقام ہے یا اقبالؔ کے یہاں عشق کا جو تصوّر ہے اس کی عظمت سے شاید وہ بھی انکار نہ کریں۔ ملاؔ کے نزدیک "ایک دردِ یکساں کی اور دوسرا دردِ مشترک کی نمائندگی کرتا ہے"۔ ملاؔ اس دردِ مشترک کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں حالاں کہ ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ عشقیہ شاعری صرف عشقیہ ہی نہیں ہوتی اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ دراصل یہ بات گھوم پھر کر عشق کے تصوّر پر آ جاتی ہے۔

ملاؔ صاحب نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں اور دونوں میں ان کی انفرادیت مسلّم ہے لیکن وہ غزل کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ غزل کو اردو ادب کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سمجھتے ہیں اور اردو زبان کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر۔ ان کے نزدیک نظم کے فنا ہونے سے اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان تو پہنچے گا مگر غزل مٹا دی جائے تو اردو زبان ہی زندہ نہ بچے گی۔ غزل کو وہ "ایک مشرب، ایک تہذیب، ایک صلح جو پیمانۂ لبریز سمجھتے ہیں"۔ وہ رمزیہ اندازِ بیان کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ غالباً رمزیہ اندازِ بیان سے وہ صرف فرانسیسی اشاریت پرستوں کی وہ شاعری مراد لیتے ہیں جو انیسویں صدی میں ایک میلان بن کر ابھری۔ اسے عام طور پر عَلامت پسندی SYMBOLISM کہا گیا ہے۔ اس میں ابلاغ کی اہمیت نہیں، ذاتی حسّیت یا من کی موج کی اہمیت ہے اور شعور سے زیادہ لاشعور کی تصویروں کی۔ غزل میں تو دراصل وہ رمزیت جو بادہ و ساغر کے پردے میں یا حدیث دلبری بن کر دلوں کو موہ لیتی ہے اور ذہن پر جادو سا کر دیتی ہے، مرکزی ہے اور غزل کا ایک خاص ذریعۂ اظہار — خود ملاؔ کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت مل جائیں گی۔

ملاؔ اپنے موقف کی وضاحت میں ترقی پسندوں سے قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ پہلو بھی ہے، مگر وہ مارکسزم، انقلاب روس، سرمایہ دار اور مزدور کی کش مکش کے گرد نہیں گھومتے۔ وہ گاندھی جی سے زیادہ متاثر ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے "میری حدیث عمر گریزاں" میں اپنے پڑھنے والوں کے نام خط میں لکھتے ہیں "کوئی

سیاسی نظریہ انسان کی مکمل نمائندگی نہیں کرسکتا اور انسانیت کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے صرف اشتراکیت ہی ایک راستہ نہیں۔" ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی نظام جس کی تبلیغ تشدد اور نفرت سے کی جائے وہ انسانیت کی راہ رہزن ہے رہبر نہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ "بہت سے ہوش مند اور سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے انسان ایسے بھی ہیں جو لال جھنڈے کو سلامی نہیں دیتے اور انسانوں کے اس گروہ میں کبھی ایک چھوٹا سا گمنام شخص گاندھی بھی تھا۔"

"جوئے شیر" میں ملّا کی کئی اہم نظمیں ملیں گی۔ چکبست کی نظم "خاکِ ہند" مشہور ہے، یہ مسدّس کے فارم میں ہے۔ ملّا کی نظم "زمین وطن اے زمینِ وطن" اپنی نغمگی، شیرینی اور کیفیت کی وجہ سے چکبست کی نظم سے کم نہیں۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات۔ لیے اپنے آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمع ذات وصفات، حجاب عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمین وطن اے زمین وطن

دوسرا بند دیکھیے:

جہاں بستر برف سے مست خواب، اٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب، جہاں آتی پہلی سنہری کرن
زمین وطن اے زمین وطن

آخری دو بند ملاحظہ ہوں:

پھر آنے کو ہیں سوئے گلشن اسیر، برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر، کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن
زمین وطن اے زمین وطن

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے، مساوات انسان کا پھر نام لے
روایات ماضی سے پھر کام لے، وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمین وطن اے زمین وطن

ایک اور نظم "نذرِ ٹیگور" کے یہ اشعار دیکھیے:

حیات فانی انسان کی انتہا ہے جہاں، مسرت ابدی دل سے آشنا ہے جہاں
بشر کی روح کی تکمیل ارتقا ہے جہاں، جہاں سے نور فشاں ہے سہیل جام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

"جوئے شیر" میں جس نظم کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ہے "ٹھنڈی کافی"۔ یہ عشق کی کامرانی کا رجز ہے۔ نظم میں رات کی تصویر کشی دیکھیے:

رات تاریک تھی جیسے کسی اندھے کی نگاہ — اتّے دکے کسی رہرو کی جھلک گاہ بگاہ!
چند لمحات کو لیٹی تھی دو رویہ سر راہ — اپنی پیدائشی وردی میں غریبوں کی سپاہ
ساعت امن یہ مابین مفاقات کی تھی

بند بازار تھے سڑکوں پہ تھی بجلی کی قطار — تھک کے سوئی تھی دلہن شہر کی پہنے ہوئے ہار
دھندلے دھندلے سے مکانات کے سینے کا ابھار — ہلکی ہلکی سی ہوا سانس کی جیسے رفتار
عصمت شہر پہ چادر سی پڑی رات کی تھی

مہاتما گاندھی کے قتل پر اردو میں بہت سی نظمیں ملیں گی۔ مجھے دو نظمیں خاص طور سے پسند ہیں۔ ایک روش صدیقی کی اور دوسری ملاّ کی۔ ملاّ کی نظم کے یہ اشعار دلوں میں حشر برپا کر دیتے ہیں۔ یہاں انھوں نے مرثیہ کے مقبول فارم مسدّس کو اپنایا ہے:

کچھ دیر کو نبض عالم بھی چلتے چلتے رک جاتی ہے — ہر ملک کا پرچم گرتا ہے ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیب جہاں تھراتی ہے تاریخ بشر شرماتی ہے — موت اپنے کیے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے
انساں وہ اٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی
سینوں میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس سے دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہیے

یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پہ رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

ایک نظم "میری شاعری" میں انھوں نے اپنے متعلق فرمایا ہے ؎

یوں دل کی دولت ملّا نے بانٹی   کچھ نذرِ خوباں، کچھ نذرِ انساں

ان کی غزلیں نذرِ خوباں بھی ہیں اور نذرِ انساں بھی۔ حسبِ ذیل اشعار سے اس رنگ کا کچھ اندازہ ہو سکے گا :۔ ؎

فروغِ محفلِ ماضی کی یادگار خموش   نظر میں ہے فقط اک اشک بے سخن باقی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار   گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
آدابِ محبّت بھی ہیں عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں   لیکن یہ تکلّف حائل ہے پہلا وہ اشارہ کون کرے
نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو   قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی
خوشی میں اپنی خوش بختی کہاں معلوم ہوتی ہے   قفس میں جا کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش   کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی
وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار   رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے   تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا
سبب میری خموشی کا مجھی سے پوچھتے کیا ہو   خموشی کیا نہیں کہتی، محبّت کی زباں سمجھو
وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت   ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

دوسرا مجموعہ "کچھ ذرّے کچھ تارے" "جوئے شیر" کے دس سال بعد شائع ہوا۔ اس کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم کا عنوان "غزل سے" توجّہ طلب ہے :۔ ؎

دلہن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا   شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
ترے نرم لہجے کو للکار دے دی   ترے دستِ نازک میں تلوار دے دی
دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو   کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو

"جادۂ ملّا" کے نام سے جو نظم ہے اس میں بھی یہی بات اس طرح کہی گئی ہے :۔ ؎

غزل محفل میں تیرے پینے والوں کی کمی کب تھی   مگر ان پینے والوں میں مری شائستگی کب تھی

کسی چوٹی پہ اک شعلہ لپک اٹھتا تو تھا لیکن غبارِ خاک کی منزل بہ منزل رہبر کب تھی

نظموں میں ایک چھوٹی سی نظم "سوغات" جو لاہور جاتے ہوئے کہی گئی اور دوسری طویل نظم "مریم ثانی" جو اس سفر کی یادگار ہے، متاثر کرتی ہیں۔ پہلی اس طرح شروع ہوتی ہے:

پھر اک تجدیدِ الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

اس کے بعد یہ اشعار توجّہ طلب ہیں:

بہ نام خطہ اقبال خاکِ میر و غالب سے سلام شوق و نذرِ دوستانہ لے کے آیا ہوں

کڑکتی بجلیوں میں گم نہ ہونے دو مرے نغمے برستی بوندیوں کا اک ترانہ لے کے آیا ہوں

ملاّ کی بیشتر نظمیں پابند ہیں۔ مجھے چند ہی آزاد نظمیں ملیں۔ ایک ہے "گل کر دو قمر کو" دوسری "صبح آزادی" اور تیسری "مریم ثانی" (ایک خط کا جواب)۔ اس نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

مجھ سے ناراض ہو کیوں کچھ مجھے معلوم تو ہو؟
دل تمھیں دے بھی چکا تم اسے ٹھکرا بھی چکیں
اب تمھیں میری خموشی سے شکایت کیا ہے؟

وضاحت کے لیے چند اشعار اور......

اور جو سوچو تو خموشی مری کہتی نہیں کیا
کتنے رنگوں کو چھپائے ہے یہ بے رنگیِ لب
مضطرب دن ہیں تڑپتی ہوئی راتیں اس میں
شوق کے خواب ہیں اور زیست کی ماتیں اس میں
یہ خموشی نہیں جیسے مرے لب تک آ کر
جم گئی ہے مرے ترسے ہوئے دل کی آواز

ایک طنزیہ نظم بھی قابلِ توجہ ہے۔ ملاّ صاحب لکھنؤ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک فیصلے میں انھوں نے پولیس کے افسروں کی چیرہ دستی اور قانون سے کھلواڑ پر سخت تنقید کی تھی۔ حکومت کے حلقوں میں یہ تنقید ناپسند کی گئی۔ اس سلسلہ میں یہ نظم ملاحظہ ہو:

کل مجھ سے یہ فرمانے لگے ایک منسٹر
طاقت ہے مری اور ہے قانون تمھارا
لہجے میں رعونت کی کھنک سی دمِ گفتار
جس طرح کہ ذرّے سے مخاطب ہو ستارا
پھر نرگسِ سرشار کو چمکا کے یہ بولے
قانون بھی میرے خمِ ابرو کا اشارا
یہ سُن کے جو تھی قبلِ ملاقاتِ سکندر
نظروں میں مرے پھر گئی وہ صورتِ دارا

"کچھ ذرّے کچھ تارے" کی غزلیں ملّا کے کلام کی پختگی اور ان کے شائستہ طرزِ سخن کی بہت اچھی نمائندگی کرتی ہیں۔ چند اشعار سے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی:

اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح، جینے کا فقط الزام نہ لے

رہروی کا سے نہ رہ نمائی ہے
آج دورِ شکستہ پائی ہے

فقط تیشہ اٹھا لینے سے منصب نہیں مل جاتا
جو جوئے شیر لاتا ہے وہی فرہاد ہوتا ہے

آزادی کس کو حاصل ہے، ہر نظم جہاں ایک زنداں ہے
بس فرق ہے اتنا کس زنداں میں کتنے روزن زنداں کتنے ہیں

کوششیں ہیں دشت کھچ آئے گلستاں کی طرف
اور گلستاں ہے کہ سوئے دشت کھنچتا جائے ہے

برق و شبنم بادو باراں خار و گل سب آئے کام
رفتہ رفتہ اک مزاجِ گلستاں بنتا گیا

اس تمنّا ہی کا شاید بڑھ کے حسرت نام ہے
جس تمنّا کے لیے خونِ جگر کافی نہیں

کسی میں دم نہیں اہلِ ستم سے کچھ بھی کہے
ستم زدوں کو ہر اک آرہا ہے سمجھانے

"تازہ کلام" کے عنوان سے "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" کے تیسرے حصّے میں تین نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "اندھیر نگر میں دیپ جلیں" دوسری کا "بوڑھا مانجھی" اور تیسری کا "اک دن انسان جیتے گا"۔ پہلی نظم اس ہنگامے کی یادگار ہے جو ملّا صاحب کے ایک فیصلے کی وجہ سے عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان ہوا تھا۔ اس نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

جس دھرتی پہ میں رہتا ہوں آکاش یہ اس دھرتی کا نہیں
دونوں کی اب بانی ہے الگ
آپس کے ناتے ٹوٹ چکے
ساتھی جو کبھی تھے چھوٹ چکے

آکاش الگ دھرتی ہے الگ
اب آمنے سامنے دو سینائیں جیسے مورچہ باندھے ہیں
دھرتی کے ذرّے اس جانب
آکاش کے تارے اس جانب

دوسری نظم "بوڑھا مانجھی" بھی آزاد نظم ہے۔ بوڑھا مانجھی سے مراد غالباً جواہر لال نہرو ہیں۔ ان کے آخری دور میں ان کے مخالف ان کی پالیسی بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

اے جوان سال مرے ہم سفرو
مجھ کو دھارے سے ہٹانے کی یہ کوشش نہ کرو
سالہا سال ہوئے میں بھی تمھاری ہی طرح
اپنی کرنوں سے اجالی ہوئی کشتی لے کر
دامن موج کو دیتا ہوا چاندی کی لکیر
ایک اٹھتے ہوئے سورج کی طرح آیا تھا
چادر آب پہ چلتی تھی مری کشتی یوں
فرش مخمل پہ قدم جیسے دھرے
ناز سے کوئی حسین رقاصہ
سینۂ بحر پہ جس طرح کھلے نور کا پھول
میری سانسوں میں تھی خوشبوئے نسیم سحری
میرے سینوں میں فروزاں تھے امیدوں کے چراغ
میرے ہر قطرۂ خوں میں تھی ستاروں کی تڑپ
میری نظروں میں تھے کچھ قوس قزح رنگ افق

تیسری نظم "اور اک دن انسان جیتے گا" اس کا آخری بند دیکھیے:

اک دیپ جلا، آندھی نے مگر تا دیر اسے جلنے نہ دیا

اک پھول کھلا، صحرا نے مگر تا دیر اسے ہنسنے نہ دیا
اک انسان الفت لے کے بڑھا، دنیا نے مگر بڑھنے نہ دیا
اکثر تو اسے جینے نہ دیا

جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا رہا، انساں ہارا شیطاں جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی، میدان بدلتے جائیں گے
اور اک دن انسان جیتے گا

ملاؔ کا آخری مجموعہ "سیاہی کی ایک بوند" ہے۔ یہ عنوان انھیں کے ایک شعر سے لیا گیا ہے ؎

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا　　فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

اس وقت یہ مجموعہ سامنے نہیں اس لیے اس کے اقتباسات نہیں دیے جا سکے۔ ملاؔ کی شاعری انسان دوستی کا رجز ہے۔ یہ ہماری مشترک تہذیب کا ایک ایسا صحیفہ ہے جس کی معنویت اور قدر و قیمت کبھی کم نہ ہو سکے گی۔ ملاؔ کی شاعری انسانیت اور تہذیب کی ان تمام اعلا قدروں کی علم بردار ہے جو ہماری تاریخ کی صدیوں کی کمائی ہیں۔ اپنی زبان اور تہذیب سے جو عشق ملاؔ کی زندگی اور شاعری میں ملتا ہے، وہ آج کے دور میں ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے۔ جے پور کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں ملاؔ نے برملا کہا تھا کہ "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا۔" زبان کا فرد کی شخصیت کی تعمیر اور سماج کی تشکیل و تہذیب میں جو رول ہے اس کے احساس نے ملاؔ سے یہ تاریخی جملے کہلوائے تھے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی وہ پُرسوز عقلیت اور دلنوازی ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کے احترام اور ان کی محبت میں خواص اور عوام سبھی شامل ہیں۔

ملاؔ صاحب کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور اردو کا سب سے بڑا انعام

اقبال سمّان بھی۔ وہ لکھنؤ کے شہری حلقے سے لوک سبھا کے ممبر بھی رہے ہیں اور انھیں راجیہ سبھا کی ممبری کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ وہ دس سال تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر بھی رہے ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی وہ سپریم کورٹ میں سینیر ایڈوکیٹ کی حیثیت سے پریکٹس کر رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار پر یہ لذیذ حکایت جو کافی دراز ہو گئی، ختم کرنا نامناسب نہ ہو گا ؎

ساقی کے سوا تشنہ لبوں سے تھا جسے اُنس — محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
قانون کی آواز میں نغمہ کی کھنک سی — یہ ساز حکیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
آتے ہی رہیں گے سرِ طور اور بھی موسیٰ — یہ ضرب کلیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مسند پہ پہنچ کر بھی رہا حامیِ جمہور — ملّا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

پروفیسر مسعود حسین

پنڈت آنند نرائن مُلّا

شاعر کے ہاتھ میں شمشیر دے کر اُسے "مجاہد" بنا دیتے وقت کوئی بھی اس بارے میں اس کے ردِّ عمل یا جذبات کا لحاظ نہیں رکھتا۔ چنانچہ مجھ سے بھی یہی غلطی ہوتی رہی اور میں پنڈت آنند نرائن مُلّا کی اُس تقریر کے حوالے سے جو انھوں نے آزادی ملنے کے فوراً بعد جے پور کی اردو کانفرنس میں کی تھی اور کہا تھا: "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا۔" ان کا قول بارہا اپنی تقریر و تحریر میں نقل کرتا رہا۔ ایک بار تو انجمن ترقی اردو کے ایک تہنیتی جلسے میں، جہاں مُلّا صاحب موجود تھے، یہاں تک کہہ گیا: "ہے اردو والوں میں کوئی اور مائی کا لال جو اس طرح کا دعویٰ کر سکے؟"

میرے اس مسلسل اصرار پر مُلّا صاحب کا ردِّ عمل مجھے حال میں معلوم ہوا جب انھوں نے ایک خط میں لکھا: "میرے مجاہدِ اردو ہونے کا ذکر تو ہر شخص کرتا ہے لیکن میرے شاعر ہونے کو سب بھول گئے ہیں۔" مجھے اس "شکایتِ ہائے رنگیں" سے دھچکا سا لگا۔ یہ نہیں کہ مُلّا صاحب کی شاعری کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔ ان کی سخن وری کا اور اُن کے اندازِ بیان اور ہونے کا اعتراف تو بہت پہلے سے ہوتا آیا ہے، یہ اور بات ہے کہ چوں کہ وہ کسی ادبی تحریک کے کفِ سیلاب بن کر نہیں ابھرے اس لیے دوسروں کی طرح ان کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا گیا! اس کے ثبوت میں مَیں آج ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز "جدید غزل گو" کی طرف اشارہ کروں گا، جس کے مرتّب اور کوئی نہیں، رسالہ "نگار" کے

مستند اور بے پناہ نقاد حضرت نیاز فتح پوری ہیں۔ "جدید غزل گو" میں ۱۹۴۰ء کے آس پاس کے ۳۱ زندہ اور معتبر غزل گوؤں کا انتخابِ کلام یکجا کر دیا ہے۔ یہ انتخاب خود انھیں شاعروں کا کیا ہوا ہے جن کو شامل کیا گیا ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملّا کا انتخاب بھی، جو اس وقت ۳۸ برس کے تھے، شامل ہے۔ وہ ایک ایسی بزم کی زینت ہیں جہاں آرزوؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، جلیل مانک پوری، حسرتؔ موہانی، ساحرؔ دہلوی، سیمابؔ اکبرآبادی، نوحؔ ناروی اور وحشتؔ کلکتوی جیسے جیّد اساتذۂ سخن براجمان ہیں۔ ۳۱ کی اس فہرست میں صرف احسان دانش اور علی اختر جیسے چند شاعر اُن سے جونیر ہیں۔ ہم عصروں میں خاص نام فراقؔ گورکھپوری کا ہے۔

انتخاب کے افتتاحیہ نوٹ میں ملّا صاحب نے اپنا سنہ پیدائش اکتوبر ۱۹۰۱ء بتایا ہے۔ ان کی باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۲۷ء میں ایک نظم سے ہوا، اس کے ساتھ غزلیں بھی ہوتے لگیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یعنی ۱۹۴۰ء تک بقول ملّا صاحب "پچاس ساٹھ نظمیں اور قریب سَو غزلیں کہی تھیں"۔ "جدید غزل گو" کے لیے سَو شعر انھوں نے انھیں سَو غزلوں سے انتخاب کیے ہیں۔ ان سَو غزلوں کی بدولت وہ غزل کے آسمانِ شعر میں اتنا بلند مقام حاصل کر چکے تھے کہ نیازؔ اپنی محفلِ سخن کے لیے انھیں دعوت نامہ بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔

ملّا صاحب کے احباب کا اصرار تھا کہ انھیں شعر گوئی کے لیے زانوئے تلمّذ کسی استاد کے سامنے تہ کرنا چاہیے کہ یہ دبستانِ لکھنؤ کی روایات کے عین مطابق تھا، لیکن ملّا صاحب یہ جواب دے کر گریز کر گئے:

> "شروع شروع میں میرے احباب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی کا شاگرد بن جاؤں، لیکن میرے ذوق نے اسے گوارا نہ کیا۔ اوّل تو یہ کہ شاگردی سے انفرادیت اس قدر مجروح ہوتی ہے کہ وہ پھر جاں بر نہیں ہو سکتی۔ استاد کا رنگ شاگرد کے کلام پر ایک نہ ایک حد تک ضرور حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات میں مختلف طریقوں سے کیف پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر ایک مخصوص عالم طاری ہوتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہو سکتا...... شاعر کے لیے سب

سے پہلے صداقت کی ضرورت ہے اور صداقت دوسرے کے رنگ میں
ڈوب کر قائم نہیں رہ سکتی !"

یہ اقتباس ملّا صاحب کی غزل گوئی کا جائزہ لینے کا بہت اچھا پیمانہ فراہم کرتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملّا صاحب کی ابتدائی (اور بعد کی بھی) شاعری میں اسی صداقت کا اظہار جو اُن کے دل میں بہ حیثیت شاعر موجود ہے۔ ان کی شاعری ان کی نجی واردات ہے۔ یہ مانگے تانگے کا اُجالا نہیں، (جس کا لکھنؤ میں بہتات تھی) یہ اتنی روایت زدہ بھی نہیں، جس کے لیے دبستانِ لکھنؤ بدنام ہے۔ اس صداقت کا اظہار میں ملّا صاحب نے نجی محاورہ استعمال کیا ہے۔ نجی ہوتے ہوئے اس میں دبستانِ لکھنؤ کی ساری شائستگی اور جِلا موجود ہے۔ ان کی زبان میں، شروع سے ذرا بھی جھول نہیں ملتا۔ یہ لکھنؤ کے کٹرہ بوتراب یا محلّہ رانی کٹرہ (ملّا صاحب کا آبائی محلّہ) کی منجھی ہوئی زبان ہے۔

ملّا صاحب کی اس دور کی غزل گوئی تمام تر نجی واردات کا عکس ہے، جیسا کہ خود کہا ہے ؎

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بے خبر نے اسے فن بنادیا

"پردۂ سخن"، میرؔ و ملّاؔ دونوں کے لیے بالآخر ان کا فن ٹھہرا۔

ملّا صاحب کشمیری الاصل ہوتے ہوئے کئی نسلوں سے لکھنوی تھے۔ لکھنؤ کے رنگِ شاعری سے کیوں کر بچ سکتے تھے، اندازِ زبان اور زبان کے پینترے ملاحظہ ہوں ؎

مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں شررِ کچھ بھی نہیں کیا؟

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور
شعلے کو دباتے ہیں تو اٹھتا ہے دھواں اور

تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینے میں بال آ ہی گیا

میری الفت نے انھیں کر تو لیا ہے اپنا
اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی رہے

ایسے "تلازماتی" اور "اشارہ بالکنایہ" اشعار کے باوجود ملّا صاحب کے ان کے ذاتی

تجربے کی صداقتیں بھی ملتی ہیں ؎

رازِ مئے نوشی ملا ہوا افشا، ورنہ　　کیا وہ بدمست نہ تھا، نعرشِ پا سے پہلے

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت　　ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی نہ ملی

ہاں دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد　　لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں

ابھی شباب ہے کر لوں خطائیں جی بھر کے　　پھر اِس مقام پہ عمرِ رواں ملے، نہ ملے

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف　　پھر خون کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

ملّا کی جذباتی اور "وارداتی" شاعری میں کہیں کہیں فکر کے چھینٹے بھی مل جاتے ہیں، گو اس دور اور اس صنف کی خصوصیات نہیں کہے جا سکتے۔ یہ فکر کبھی سماجی ہے اور کبھی کائناتی ؎

ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا　　دنیا کو اہلِ امن نے مدفن بنا دیا

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا رُوئے ہستی سے　　ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

ملّا صاحب کی شخصیت سب سے زیادہ بے نقاب ہوتی ہے، مذہب کی جانب اُن کے مخصوص روّیے سے۔ ایک کشمیری برہمن زادہ کا (جو لکھنؤ پہنچ کر مُلّا سے مُلّا بن چکا تھا) یہ اندازِ فکر دنیائے اردو کو سب سے زیادہ چونکا دینے والا انداز ہے ؎

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے، نہیں کچھ صحنِ مے خانہ　　ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

ملّا صاحب کی جس دور کی غزل گوئی سے بحث کی جا رہی ہے (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء) اس کی مدّت کُل دس گیارہ سال ہے۔ فنّی نقطۂ نظر سے وہ اپنے سرمایہ اور اس کی تاریخ سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن کے یہاں دوسرے شاعروں (جونیر اور سینئر دونوں) زمینوں میں غزلیں ملتی ہیں۔

وہ چاہے جگر کی مشہور غزلوں (پہچانی نہیں جاتی، پشیمانی نہیں جاتی) یا (کم ہوتی جاتی ہے، مدّھم ہوتی جاتی ہے)، ہو یا جذبی کی "....کون کرے" والی ردیف کی غزل ہو۔ اصغر گونڈوی کی زمینوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور فانی کی بھی۔

میرا خیال ہے کس شاعر نے کس سے کیا استفادہ کیا ہے اس کا دل چسپ مطالعہ مشترک اوزان، مشترک قوافی اور مشترک ردائف سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ملّا صاحب ۱۹۴۰ء تک دوسروں کی لیکھ اختیار کرنے کے باوجود مجموعی طور پر اپنی ڈگر علاحدہ بنا چکے تھے۔ ان کے بعض ذہنی رویّے (مثلاً آزادی فکر و خیال) اس دور تک مستحکم ہو چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے فن پر چھاپا مارا ہے ان کے منصب اور پیشے نے، جس کا رونا انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ اقبال نے اپنے فن پر اپنے پیشے کو قربان کر دیا، ملّا صاحب ایسا نہ کر سکے۔

جو یہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی

ہمارے مُلّا صاحب

جن حضرات نے مرحوم ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ناول "آدھا گاؤں" پڑھا ہو گا، انھیں اندازہ ہو گا کہ ہم لوگ ایک پچھڑے ہوئے دیہات میں مٹی کے تیل کی لالٹین میں پڑھا کرتے تھے۔ وہاں سے نکلے تو غازی پور جیسے پچھڑے شہر کو دیکھا جہاں چورا ہے پر پہلی مرتبہ پولیس نظر آئی، اسپتال، کوتوالی، بازار بھی دکھائی دیا، جہاں گول گول رنگ برنگ کی انگریزی مٹھائی ملتی تھی۔ اس کے بعد ایک سال والد صاحب کے ساتھ کانپور رہ کر لکھنؤ آیا جو اس وقت نوابوں، تعلقہ داروں اور بڑے بڑے انگریزوں کا شہر تھا۔ لکھنؤ میں میرا ابتدائی زمانہ اور دیہات سے آئے ہوئے لکھنؤ جیسے شہر کی چکا چوند کرنے والی زندگی تھی۔

ہم لوگ عام طور سے چوک جاتے تھے، کبھی کبھی امین آباد جانے کا موقع ملتا تھا، جہاں کی دکانوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا، حضرت گنج تو شاذ و نادر ہی جانا ہوتا تھا جو پوری طرح ہمارے تصور سے باہر تھا۔

بہر حال جب کرسچین کالج کے پاس سے گزرتے تو سرخ اینٹوں کی ایک شاندار عمارت سے گزرتے جہاں پنڈت آنند نرائن ملّا صاحب کے والد پنڈت جگت نرائن ملّا صاحب مرحوم رہا کرتے تھے، جو اپنے زمانے کے ایک زبردست وکیل تھے۔ مگر جب ملّا صاحب سے قربت ہوئی اور پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ کرایہ کی کوٹھی تھی۔ باپ بیٹے دونوں

خوشحال ہونے کے باوجود ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ اتّفاق سے اسی کوٹھی کے آگے گولاگنج کے چوراہے پر پہلی کوٹھی میں میرے ایک عزیز علی محمد صاحب ایڈوکیٹ رہا کرتے تھے جہاں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا۔ اب وہ پوری سڑک چکبست نرائن روڈ کہلاتی ہے۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں کمپنی باغ میں ایک نمائش ہوئی، جس میں ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ شب میں اس کی صدارت نواب صاحب چھتاری نے کی، جو میرے والد کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ اس کے بعد باغپت کے نواب سر جمشید علی خاں صدر ہوئے، جن کے تیسرے صاحبزادے کنور سجّاد علی خاں صاحب میرے سینٹ جانسن کالج کے ساتھیوں میں سے تھے۔ بہرحال دن کی نشست میں اس مشاعرہ کی صدارت جگت نرائن ملّا صاحب نے کی جن کو میں نے پہلی اور آخری بار دیکھا تھا، جو معمّر تھے، مگر اب تک مجھے ان کا دمکتا ہوا بارونق چہرہ یاد ہے۔

میرا بچپن اور ملّا صاحب کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ وکیل بن چکے تھے اور ایک چھوٹی سی گاڑی میں کبھی کبھی دکھلائی دیتے تھے، جسے وہ خود چلاتے تھے مگر مشاعروں میں شاذونادر ہی جانا ہوا، اس لیے لکھنؤ میں کسی محفل میں انھیں نہ دیکھ پایا۔

البتّہ جب اعظم گڑھ میں شبلی اکیڈمی کے جشنِ طلائی منایا گیا تو اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریۂ ہند، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، کرنل زیدی، ڈاکٹر سیّد محمود، مولانا عبدالماجد دریابادی، بیگم صاحبہ بھوپال وغیرہ نے شرکت کی۔ اس میں مرحوم سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مجھے مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس شب میں ایک بہت بڑا مشاعرہ بھی ہوا، جس میں آنند نرائن ملّا صاحب نے صرف شعر ہی نہیں پڑھا بلکہ صدارت بھی کی۔ اس وقت ان کی شخصیت کا بھرپور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ نیز بحیثیت جج کے ان کا آخری فیصلہ بھی ان کی انسانیت اور انسان دوستی کا پورا آئینہ دار ہے۔ ملّا صاحب کی وہ نظم "لے کے آیا ہوں" بھی یادگار رہے گی جسے انھوں نے تقسیم ہند کے بعد لاہور جاکر پڑھی تھی۔

جب میں فخر الدین میموریل اردو کی کمیٹی کا صدر بنا تو میں نے یہ اسکیم شروع کی کہ ادبا کو احتراماً انعام سے نوازا جائے۔ نیز میٹنگ میں جب میں نے ملّا صاحب کا نام پیش کیا تو ایک صاحبہ نے اعتراض کیا کہ ملّا صاحب نے تو کاکوری کیس میں اپنے والد کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے وکالت کی تھی۔ جب میں نے ملّا صاحب سے اصلیت پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ جب گورنمنٹ نے میرے والد کو وکیل بنایا تو انھوں نے شروع ہی میں بیس آدمیوں کو ملزموں کی فہرست سے نکال دیا، جسے حکومت نے بہت بُرا مانا۔ بہرحال ان کے والد ایک تو بحیثیت وکیل کے تھے، دوسرے یہ کہ وہ غالباً لبرل پارٹی میں تھے جس میں لیڈر سرسی۔ وائی۔ چنتامنی اور سر تیج بہادر سپرو بھی تھے۔ نیز یہ حضرات غالباً چھ مہینے وزیر بھی رہے۔ ملّا صاحب اس وقت بحیثیت ایک جونیر وکیل کے اپنے والد صاحب کے ساتھ کام سیکھ رہے تھے۔ بعد میں ملّا صاحب خود کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ پی بنے اور لکھنؤ سے الکشن لڑے۔ نیز ان کے ورکروں میں اس وقت عمّار رضوی صاحب تھے، جو خود بعد میں وزیر بنے۔

جب شہنشاہ اکبر کے آخری زمانہ میں جہانگیر نے بغاوت کی اور الٰہ آباد کو اپنا مرکز بنایا، تو باپ نے بیٹے کو بلایا، جو ڈر رہا تھا کہ کہیں مروا نہ دیا جائے۔ اس وقت اس نے حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالا اور یہ غزل نکلی:

چرا نہ در پی عزم دیار خود باشم
چرا نہ خاک سرکوی یار خود باشم
غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم
بشہر خود روم و شہریار خود باشم

اس فال کے بعد جہانگیر فوراً باپ کے پاس پہنچا اور کچھ ہی دنوں میں تخت و تاج کا مالک ہو گیا۔ جب میں انعام کے موقع پر ملّا صاحب کو لکھنؤ کے اسٹیشن پر لینے گیا تو موٹر میں میں نے حافظ کا یہ شعر سنایا، نیز مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ شہر جو ان کا وطن تھا وہاں وہ واپس آ رہے تھے۔ یہ بھی میری سعادت تھی کہ میں ان کے ہمراہ تھا۔ میں نے انعام کی

تقریب میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر عدالت کی ہتک حرمت نہ ہو تو میں کہوں گا کہ آج کے جج صاحبان ملّا صاحب کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ اس موقع پر ملّا صاحب کی غزلیں گائی گئی تھیں خاص کر یہ غزل کہ "لے کے آیا ہوں"۔

لکھنؤ ہماری گنگا جمنی مشترک تہذیب کا مکمّل نمونہ رہا ہے اور ملّا صاحب جیسی شخصیتوں نے اسے جاندار اور مستحکم کر دیا ہے۔

آخر میں یہ بھی کہہ دوں کہ مضمون یادداشت سے لکھا گیا ہے، ممکن ہے کہ اس کے جزئیات میں مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو۔

عمر انصاری

مُلّا صاحب کے حوالے سے

کچھ یادیں کچھ باتیں

عصرِ حاضر میں پنڈت آنند نرائن ملّا، اُن خوش نصیب لوگوں کی فہرست میں سرِفہرست ہونے کا درجہ رکھتے ہیں، جو پٹواری کی طرح کسی پر اپنا کوئی واجب نہیں چھوڑتے، چاہے اُن پر کسی کے کتنے ہی واجبات کیوں نہ ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب تک انھیں جتنے ایوارڈز مل چکے ہیں اور جو رُتبہ اور اعزاز اُنھیں حاصل ہے، وہ کم از کم آج کی اردو دنیا میں تو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔

ملّا صاحب کی شاعری لکھنؤ اسکول کی پروردہ ہے، یہیں اُنھوں نے آنکھ کھولی اور یہیں کی مٹّی سے اُن کی شخصیت اور شاعری کا خمیر اُٹھا، جس میں عصری حسّیت اور اُن کی شعوری کوششوں نے وہ چار چاند لگائے کہ آج کا لکھنؤ پکار پکار کر یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ میرے ماضی پر نظر کرنے والو، میرے حال کو دیکھو اور پھر یہ بتاؤ کہ میرے دامن میں وہ کیا نہیں جس کی تمھیں تلاش ہے۔ اور درحقیقت آج کے لکھنؤ کی شاعری، ملّا صاحب اور اُن کے چند رُفقا ہی کی شاعری سے عبارت ہے۔ یہ کہہ کر گزر جانا ہرگز انصاف کی بات نہیں، جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے حبیب احمد صدّیقی صاحب آئی۔ اے۔ ایس سے جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور اُنھیں کے دولت کدے پر فروکش تھے، فرمایا کہ "لکھنؤ آتے ہیں، تو شعر تو ملّا صاحب اور عمر انصاری ہی سے سننے کو ملتے ہیں، لیکن یہ دونوں

بھلے ہی لکھنوی ہوں، اِن کی شاعری لکھنوی نہیں۔"

یہاں پر یہ تحریر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے ملّا صاحب خود بھی کچھ سرور صاحب ہی کے جیسے خیالات رکھتے ہیں اور ابھی ایک حالیہ ملاقات میں جب میں یہ سن کر کہ وہ دلّی میں پارلیمنٹ ہاؤس کی سیڑھیوں سے گر گئے ہیں، اُن کی مزاج پُرسی کے لیے دلّی اُن کی رہائش گاہ پر پہنچا، تو اُنھوں نے بھی لکھنوی شاعری کی بُرائی کرتے ہوئے سراج لکھنوی کا یہ شعر پیش کیا ؎

آپ کے پانو کے نیچے دل ہے
اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

اور کہا کہ میں بھی مشاعرے میں شریک تھا، لیکن داد سب سے زیادہ اِسی شعر پر ملی۔

جواب میں اب ایسے موقع پر میں اور کیا کہتا، بس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ:

"ملّا صاحب! آج کے لکھنؤ کی شاعری کا تجزیہ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور سراج لکھنوی کی شاعری کو سامنے رکھ کر نہیں، بلکہ ملّا صاحب اور عمر انصاری کی شاعری کو پڑھ کر کیا جانا چاہیے اور اس شعر میں بھی ہر چند کہ کسی "گل بدنِ سُرخ"[1] کی مدح سرائی نہیں، لیکن ایک بڑی تہذیب اور معاشرے کی نمائندگی کے آثار نظر آتے ہیں کہ لوگ کس انداز سے گفتگو کرتے تھے اور کیا مفاہیم مراد لیتے تھے۔ آخر رموز و علائم کا بھی شاعری میں کوئی مقام ہے کہ نہیں؟"

اور سہلِ ممتنع کہنے میں بھی کیا بُرائی ہے؟ اور پھر بات کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے یوں بھی گویا ہوا کہ:

"معلوم ہوتا ہے ملّا صاحب اس مشاعرے میں آپ کو کچھ داد واد ملی نہیں، جس کی بنا پر آپ ڈنڈا لے کر بے چارے سراج صاحب پر پل

---

[1] "میں بھی دیوانہ ہوں اے گل بدنِ سُرخ ترا"، (مجروح)

پڑے اور ایک شاعر کے ایک شعر کی بنیاد پر سارے مکتبۂ فکر کو گردن زدنی قرار دے دیا۔ آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ سراج لکھنوی نے بعض اچھے اور بعض بہت اچھے شعر بھی تو کہے ہیں جیسے :

آنکھوں میں آج آنسو پھر ڈبڈبا رہے ہیں
ہم کل کی آستینیں اب تک سکھا رہے ہیں"

ظاہر ہے کہ میرے جواب میں ملّا صاحب کی ترقی پسندی کے اُس اعلان کی بھی کسک پائی جاتی ہے، جس سے یقیناً اہلِ لکھنؤ کے دلوں پر چوٹ لگی تھی اور انھوں نے سمجھا تھا کہ مجاز ردولوی اور مجروح سلطانپوری کی طرح ہمارے اس شاعر کو بھی بھیڑیے اٹھا لے گئے۔ اور جس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اُن دنوں پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور دونوں ہی لکھنؤ یونیورسٹی میں جمع ہو گئے تھے اور یہ دونوں حضرات بنّے بھائی (سیّد سجّاد ظہیر) کی چلائی ہوئی تحریک کے نہ صرف ہم نوا تھے، بلکہ ان کے تیر کمان بنے ہوئے تھے، تحریک کے شباب کا بھی وہی زمانہ تھا اور ان دونوں پروفیسر صاحبان سے ملّا صاحب کے گہرے روابط تھے۔ حضرت گنج انڈیا کافی ہاؤس میں ان سب کی بیٹھکیں جمتیں، جہاں کا قاعدہ یہ تھا کہ ملّا صاحب کی میز پر، جو کئی میزوں کو ملا کر ایک کر دی جاتی تھی، جس کا جو دل چاہے کھائے پیے، لیکن بل ادا کرنے کا حق کسی کو نہ تھا، بل ملّا صاحب ہی ادا کرتے تھے۔ وہیں ملّا صاحب کے شعر سن سن کر اور خاص طور پر اُن کی نظم "ٹھنڈی کافی" سن کر ان دونوں پروفیسران نے ملّا صاحب کو یہ یقین دلانا شروع کیا کہ آپ تو ترقی پسند شاعر ہیں۔ اور ایک صبح ملّا صاحب کو یقین آ گیا کہ ہاں میں تو واقعی ترقی پسند شاعر ہوں۔

میں غور کرتا ہوں تو ملّا صاحب کے اس رویّے کو فراق صاحب کے اُس رویّے سے بالکل مختلف پاتا ہوں کہ وہ کہا کرتے تھے اور جسے خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ "ترقی پسند میرا بھی نام لیے پھرتے ہیں۔ لیکن کہاں وہ "وَن ٹریک مائنڈڈ" اور کہاں میں چوکھا شاعر۔"

جہاں تک ترقی پسندی کا سوال ہے، مجھے آج تک کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ملا جو اپنے آپ کو تنزّل پسند مانتا ہو، نہ ہی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہے، یہ تو دریا

کی مہر ہے، ابھی یہاں، ابھی وہاں اور ابھی اور آگے۔ اور اسی قانونِ فطرت کا ہمارے لکھنؤ کی شاعری پر بھی اطلاق کیا جانا چاہیے۔ اور اسی بنیاد پر میں یہ تو مانتا ہوں کہ ملّا صاحب بے شک ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن وہ ترقی پسند شاعر اور ہم سے علاحدہ کوئی چیز ہیں، یہ ماننے سے معذرت چاہتا ہوں۔ اور اس سلسلہ میں اگر ملّا صاحب سے بالمشافہ بھی گفتگو ہو تو میں یہی عرض کروں گا کہ :

"نہیں ملا صاحب۔ آپ کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہوں، آپ ہمارے دبستان کے شاعر ہیں اور ہماری نمائندگی کرتے ہیں، آپ کو ہم اپنا نمائندہ شاعر تسلیم بھی کرتے ہیں اور مقرر بھی کرتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے اردو مہم میں اپنا قائد بنایا۔"

اور ہمارے ملّا صاحب کو تحریک کا ترقی پسند شاعر نہ ماننے کے وجوہ بھی موجود ہیں۔

ملّا صاحب کبھی کسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں بنے، جو تحریک کے ترقی پسند شاعر ہونے کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک لازمی شرط قرار دی گئی تھی، نہ ہی اُنھوں نے کبھی کمیونسٹ پارٹی کے روزانہ بدلتے رہنے والے پروگراموں پر بہ قول حیات اللہ انصاری، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی طرح عمل کیا، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بھی باقاعدہ ممبر نہیں رہے۔ اور برعکس اِس کے وہ کانگریسی دل و دماغ رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ کانگریس میں شامل رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے اجلاس میں جو لکھنؤ موتی نگر میں منعقد ہوا تھا، اُس کے اُس مہتم بالشان مشاعرے کے صدر مجلس استقبالیہ وہی تھے، جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور صدارت بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے اور جس کا سوینیر "جواہرات" آج بھی اس دور کے ادبی رجحانات جاننے کے لیے سب سے معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملّا صاحب کی وہ استقبالیہ نظم جو اُنھوں نے مسز نائیڈو کے لیے لکھی اور پڑھی تھی، اس سوینیر میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ ۱۹۳۶ء ہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا افتتاحیہ جلسہ منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ ہی میں منعقد ہوا تھا۔

ملّا صاحب کے کانگریسی ہونے کے اتنے شواہد موجود ہیں کہ سب کو یک جا کرنا مضمون

کو لامتناہی کر دینے کے مصداق ہوگا، حد یہ ہے کہ جب ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد اُنھیں پارلیمنٹ کا لکھنؤ کی سیٹ سے کانگریس کا ٹکٹ نہیں مل سکا اور وی۔آر۔موہن کو دے دیا گیا، تو وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الکشن لڑے اور جیت کے پھر کانگریس میں شامل ہو گئے اور لکھنؤ میں اُن کی کتاب "سیاہی کی ایک بوند" کی رسمِ اجرا مسز اندرا گاندھی نے ادا کی۔

ملّا صاحب کی شاعری کی ابتدا ۲۸/۱۹۲۷ء میں انگریزی زبان کی شاعری سے ہوئی اور ان کے لکھنوی شاعر ہونے کا بنیادی ثبوت وہیں سے فراہم ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے میر انیسؔ کے کلام سے متاثر ہوئے اور میر انیسؔ کی کئی رباعیات کا منظوم ترجمہ اُنھوں نے انگریزی میں کیا۔ اُس کے بعد وہ اردو کی جانب متوجہ ہوئے اور جوشؔ ملیح آبادی سے روابط کی بنا پر اُنھیں غزل کے ساتھ نظم لکھنے کا بھی چسکا لگ گیا۔ نظم کی صنف ملّا صاحب کے جیسا دل و دماغ رکھنے والے شاعر کے لیے زیادہ مناسبت بھی رکھتی تھی کہ اُس میں اُنھیں اپنے دماغ کی اُپج نکالنے کے بہتر مواقع فراہم تھے۔ پھر اُنھوں نے یہ کیا کہ اقبالؔ کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ ابتدا میں اقبالؔ سے لڑے بھی کہ ہمارے میخانے کا میخوار خواہ مخواہ حجازی بن بیٹھا، لیکن شاید بعد میں اُن کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ اقبالؔ کے اس حد تک مدّاح بن گئے کہ اپنے پُرانے دوست سراجؔ لکھنوی کو اُنھوں نے کلامِ اقبالؔ پڑھنے کی ترغیب دی اور سراجؔ لکھنوی نے اپنے دیوان "شعلۂ آواز" میں اس کا اقرار کیا کہ ملّا صاحب کے توجہ دلانے پر میں نے اقبالؔ کو پڑھا تو پتا چلا کہ

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی"

ہر چند کہ وہ دور ہی گویا نظم گوئی کا دور تھا۔ لکھنؤ میں ملّا صاحب کے علاوہ بھی کئی اور شعرا بالاہتمام نظمیں لکھ رہے تھے، جن کے مجموعہ ہائے نظم بھی شائع ہو چکے ہیں اور اُس زمانے کے تمام رسائل و اخبارات میں ان کی نظمیں چھپتی رہتی تھیں، لیکن ملّا صاحب کی ہوش مندی کا یہ ایک اور بہتر ثبوت ہے کہ اُنھوں نے نظم کی طرف متوجہ ہو کر بھی غزل کی شاعری کو جوشؔ ملیح آبادی کی طرح بالکل ترک نہیں کیا اور عروسِ غزل کی شانہ کشی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہے۔ اُنھوں نے غزل کی پرانی اور صالح روایتوں کو توڑا نہیں، کئی نئے اسالیب کے ساتھ اُنھیں جوڑا ہے

اور اس کوشش کی بدولت اُن کے کلام میں ندرت و انفرادیت کے ایسے عناصر داخل ہوئے ہیں جو خود اُن کی شخصیت کو منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ وہ خود غزل کے سلسلے میں اپنی مساعیِ جمیلہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ:

"کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو"

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ صنفِ نظم کو صنفِ غزل پر ترجیح دیتے ہیں۔

ملّا صاحب نے ۱۹۳۰ء میں جب مشاعروں کی دنیا میں قدم رکھا تو کم و بیش وہی زمانہ میرے بھی آغازِ شاعری کا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑے ہیں اور عمرِ شاعری میں بھی۔ ۱۹۳۲ء میں جب میں لکھنؤ کی مرکزی انجمن معین الادب کا ممبر بنا اور اُس کے جس پہلے مشاعرے میں پہنچا، جس کی طرح تھی "قول و قرار کچھ نہیں، پھر بھی ہوں انتظار میں" تو میں نے وہاں ملّا صاحب کو پہلے سے بیٹھا پایا۔ معین الادب کے سرپرست سر تیج بہادر سپرو تھے، صدر مولانا علی نقی صفی لکھنوی اور سکریٹری بہار لکھنوی۔ اور بہار صاحب کی یہ سکریٹری شپ بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی سکریٹری شپ تھی۔ پہلے وہ جا کر دعوت نامہ دے آتے، پھر وعدہ لینے جاتے، پھر یہ پوچھنے جاتے کہ حضور نے غزل شروع کر دی اور کچھ شعر کہہ لیے ہیں یا نہیں، کیوں کہ اس طرح انھیں یقین ہو جاتا کہ اگر شاعر نے دو ایک شعر بھی کہہ لیے ہیں تو وہ مشاعرے میں ضرور آئے گا۔ پھر ایک مرتبہ یاد دہانی کے لیے جاتے کہ حضور کل یا پرسوں مشاعرہ ہے، تجدیدِ وعدہ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے اس اہتمام کے ساتھ مشاعروں میں مدعو کرنے والا پھر کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔

بہرحال بہار صاحب کو اپنی خدمات کا صلہ اس صورت میں ملا کہ اُن کے انتقال کے بعد شہر کی ایک اور انجمن معراج الادب کے ساتھ معین الادب کا الحاق کر کے ایک نئی انجمن کی تشکیل کی گئی اور اُس کا نام بہار صاحب کے نام پر بہارِ ادب رکھا گیا۔ لیکن یہ الحاق بھی ملا صاحب ہی کی کوششوں کی بدولت عمل میں آیا کہ اُس وقت ملّا صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا اس کام کو انجام دینے کا اہل ہی نہ تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ معراج الادب کے سارے ممبران جو ینگ پارٹی کے نام سے جانے جاتے تھے، پہلے معین الادب ہی میں شامل تھے، لیکن بعد میں علاحدہ ہو کر انھوں نے اپنی الگ انجمن بنا لی تھی۔ ملّا صاحب ایک طرف تو معین الادب کے ممبر تھے اور معین الادب میں شامل

تمام اساتذہ ان پر بڑا پیار نچھاور کرتے تھے اور دوسری طرف معراج الادب والوں سے وہ معاصرانہ یارانے رکھتے تھے۔ لہٰذا اُن کے علاوہ کوئی دوسرا تھا ہی نہیں جو ان بچھڑے ہوؤں کو پھر سے ملا سکتا۔ بہار ادب کے پہلے جنرل سکریٹری بھی ملّا صاحب ہی مقرر ہوئے اور اُن کے ساتھ قدیر لکھنوی اور عمر انصاری سکریٹریز، لیکن ہی عملی طور پر یہ ہوگیا کہ ایک سال ملّا صاحب جنرل سکریٹری رہتے اور دوسرے سال سیّد آل رضا جنرل سکریٹری بنا دیے جاتے۔ جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو جنرل سکریٹری آتا، کوشش کرتا کہ اُس کے زمانے میں کوئی ایسا مشاعرہ ہو جائے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہو۔ چنانچہ اِسی مہم کی یادگار لکھنؤ کے وہ دو مشاعرے ہیں، جن میں سے ایک "محفلِ شعر و نغمہ" کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا "دریائی مشاعرہ" کہلایا۔

"محفلِ شعر و نغمہ" میں، جو سیّد آل رضا کی جنرل سکریٹری شپ میں منعقد ہوئی، جہاں اُس وقت کے متحدہ ہندوستان بھر کے مشہور و معروف شعرا و اساتذہ کو دعوتِ شرکت دی گئی اور ایک رات سفید بارہ دری قیصر باغ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جو پھر دیکھنے میں نہ آیا، وہیں دوسری رات ملک بھر کی مشہور و معروف گانے والیوں نے انھیں شعرا کی معرکۃ الآرا طبع زاد غزلیں گا کر سنائیں جو انھیں ایک ماہ قبل دے دی گئی تھیں اور وہ سب بڑی تیاریوں کے ساتھ آئی تھیں۔ غرض کہ یہ پروگرام ایسا ہوا کہ محفل تو ایک رات سجی اور ختم ہوگئی، لیکن اس کا چرچا برسوں چلا اور بعض مقامی شاعروں نے تو اپنی گانے والیوں کے کوٹھوں کو اپنا شام کا بیٹھکا ہی بنا لیا۔ سراج لکھنوی نے یہ شعر اپنی گانے والی ہی کے لیے کہا تھا:

کبھی تو گا کے کبھی گنگنا کے لوٹ لیا
مرا کلام مجھی کو سنا کے لوٹ لیا

اور اب باری تھی ملّا صاحب کی، میں نے اور قدیر صاحب نے ملّا صاحب کے ہاں آمد و رفت بھی تیز تر کردی کہ کوئی پروگرام ایسا ہی ترتیب دیا جا سکے جو "محفلِ شعر و نغمہ" کا جواب ہو سکے۔ بہر حال ایک شام ملّا صاحب ہی نے کہا کہ بھئی تقریبات کے انعقاد میں موسم کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے اور آج کل کے موسم کا تقاضا ہے کہ "دریائی مشاعرے" کا اہتمام کیا جائے۔ پہلے سب لوگ دریائی مشاعرے کا نام سن کر بہت حیرت میں پڑ گئے، پھر سب نے دیکھا کہ دریائی مشاعرہ اس شان

سے منعقد ہوا کہ گرمیوں کا زمانہ تھا، چاند کی چودھویں تاریخ، گومتی کے پانی کی سطح پر ایک ایسا مہتم بالشان پنڈال تیار کیا گیا کہ پورا پنڈال ایک شاندار بجرہ نظر آتا تھا، چاروں طرف پانی چاند کی کرنوں کو اپنی لہروں میں سمیٹے پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا اور شعرا اُسی روانی کے ساتھ مختلف پھولوں کی خوشبوؤں سے بسے ہوئے پنڈال میں باری باری اپنا کلام سنا رہے تھے، مصرع طرح بھی اسی مناسبت سے مولانا صفی نے نکالا تھا:

"دریا کی روانی ہے، بہتا ہوا پانی ہے"

مجھے یاد ہے، ملّا صاحب اور امین سلونوی یو۔پی کانگریس کے سالانہ جلسوں میں بھی امین الدولہ پارک میں مشاعروں کا اہتمام کرتے، جن میں سے ایک مشاعرے کی طرح تھی:

"وطن پرست، وطن پر نثار ہوتے ہیں"

اور ایک مشاعرے کی طرح:

"ہمارا ہی ہے گلشن اور ہمیں بھارو ہیں گلشن میں"

اور یہ مشاعرے، اُن مشاعروں کے علاوہ ہوتے، جو بہار ادب کے ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے، ملّا صاحب کے دور میں بہار ادب ملک کی مقتدر ترین انجمنوں میں شمار ہوتی۔ مالک رام صاحب نے بھی اپنی یادداشتوں میں انجمن بہار ادب کو یاد کیا ہے۔

ملّا صاحب بہت ہی متحرک اور فعال شخصیت ہیں، لکھنؤ سے دلّی منتقل ہو جانے کے بعد بھی جب وہ لکھنؤ آتے تو پہلے سے مجھے مطلع کروا دیا کرتے۔ میں اُن کی آمد پر "بزم شعرائے لکھنؤ" کی شعری نشست کا اہتمام کرتا، ملّا صاحب کی آمد کی خبر سن کر لوگ اور بھی زیادہ بڑی تعداد میں شرکت کرتے، اور اس طرح ایک بڑی بھری پُری نشست ہو جایا کرتی۔ ایک بار میں نشست میں اُنھیں لانے کے لیے جب نرالا نگر پہنچا جہاں وہ مقیم تھے، تو دیکھا تنہا تاش کی بازی جمائے بیٹھے ہیں اور دونوں طرف سے چالیں چل رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ تنہائی میں بھی خالی بیٹھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

پیشہ کے اعتبار سے ملّا صاحب نے وکالت ہی سے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا، لیکن وکالت شروع کرتے ہی جو پہلا مقدّمہ اُنھوں نے لڑا، وہ بھی ایک ادبی مقدّمہ تھا، جس کا عنوان

تھا "سراج لکھنوی بنام اَفقر موہانی" اور جس میں سراج لکھنوی نے یہ شکایت کی تھی کہ اَفقر موہانی میرے کلام کو سراج جھنجھانوی کا بتاتے ہیں اور مولانا اَفقر موہانی نے واقعی سراج جھنجھانوی کا ایک کرم خوردہ دیوان نہ جانے کیوں کر تیّار کر کے پیش کیا تھا، جس میں وہ بہت سی غزلیں موجود تھیں جو سراج لکھنوی پڑھا کرتے تھے۔ یہ مقدّمہ ادبی اعتبار سے بھی بڑا ہی دلچسپ مقدّمہ تھا اور اُس وقت کے تمام اہم شعرا سراج لکھنوی کی جانب سے خانۂ شہادت میں آئے تھے، جن سے بڑی ادبی اور فنّی جرحیں کی جاتیں۔

میرے ساتھ اُن کے روابط اور وضع داری کا یہ حال ہے کہ ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والی "جشنِ عمر انصاری" کی تقریب میں جب وہ سپریم کورٹ کے کسی مقدّمہ کی مصروفیت کی بنا پر شرکت نہ کر سکے، تو لکھنؤ آتے ہی صباح الدین عمر کو ساتھ لے کر میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور پھولوں کے ہاروں کے ساتھ زری کے بہت ہی بیش قیمت ہار سے مجھے نوازا اور میری عزّت افزائی کی۔

وہ ہمیشہ مجھے "استاد عمر انصاری" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور گلے لگاتے ہیں۔ لیکن اُستادی شاگردی کی روایت سے انحراف کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں شاعری کے لیے استادی شاگردی کی قطعی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ایک ملاقات میں جو دلّی میں انھیں کے دولت کدے پر ہوئی، کہنے لگے آج کل کیا ہو رہا ہے، میں نے کہا "شاعری" کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام سیکھا ہی نہیں۔ کہنے لگے "بھئی، یہاں دلّی میں تو میرے زیرِ اثر استادی شاگردی کا انسٹی ٹیوشن ہی ختم ہو گیا، تم بتاؤ کہ لکھنؤ میں اسے کب ختم کرو گے۔" میں نے عرض کیا،

"ملّا صاحب آپ اس پر جتنا چاہے فخر کریں، آپ کی مرضی ہے، لیکن غالبؔ نے تو اس خیال سے کہ کوئی اُنھیں بے اُستادہ نہ کہے، ایک خیالی استاد ہُرمزد عبدالصّمد خود تخلیق کر لیا تھا اور اُس پر غالبؔ کو بڑا ناز تھا، اِس حد تک کہ اسی کو بہانہ بنا کر وہ قتیل اور صاحبِ غیاث اللغات جیسے اساتذہ سے بھڑ گئے اور جو منھ میں آیا سو کہہ ڈالا، ورنہ استاد کا نام لیے بغیر غالبؔ میں یہ جرأت کہاں سے آتی۔

اور آپ اس انسٹی ٹیوشن کے ختم کرنے کی جو بات کرتے ہیں،

تو وہ ہمارے آپ کے ختم کیے ہرگز ختم نہ ہوگا۔ دلّی ہی میں مجھے ذرا اُس شاعر کا نام تو بتائیے، جو کبھی کسی کا شاگرد نہ رہا ہو، انھوں نے کہا "گلزار"۔ میں نے "کیوں؟ کیا گلزار نے کبھی اپنے والد زار صاحب سے اصلاح نہ ہوگی"۔ بولے "وہ تو انھوں نے باپ بیٹے کے رشتے سے مشورۂ سخن کر لیا ہوگا"۔ میں نے کہا "ملّا صاحب! باپ بیٹا ہو یا بیٹا باپ، مشورۂ سخن تو شاگردی کی علامت ہے"۔

ایک اور موقع پر جب انھوں نے ایک غزل سنائی، جس کا قافیہ دام، نام وغیرہ تھا اور ردیف "دو"، تو اُس وقت تو میں نے غزل سن لی، لیکن اُس کا ایک مصرع میرے ذہن میں رہ گیا، کیوں کہ اُس پر میرا دماغ آٹکا تھا۔ لہٰذا میں نے اُن کے جاتے ہی، اُن کے دلّی کے پتہ پر ایک خط لکھ مارا۔ اور لکھا کہ:

"ملّا صاحب! آپ نے جو غزل سنائی اور جس شعر کا پہلا مصرع کچھ یوں تھا، کہ آپ نے اللہ میاں سے کہا ہے کہ زمانہ بہت خراب آگیا ہے، لہٰذا اُس کی تعمیرِ نو کے لیے:

پھر کوئی غالبؔ، کوئی حافظؔ، کوئی خیّامؔ دو

میرا خیال ہے کہ خواہ مخواہ آپ نے فارسی ہی کے تین تین شاعروں کو جمع کر دیا ہے۔ اور اگر آپ کہیں کہ غالبؔ کو اردو شاعر کی حیثیت سے لیا ہے، تو بھی میں عرض کروں گا کہ اردو کے بعد فارسی کے دو دو شاعروں کو ٹھونسے رکھنا اور ہندی کے تلسی داس کو چھوڑ دینا، کوئی مناسب بات نہیں، میرے نزدیک تو یہ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا:

پھر کوئی غالبؔ، کوئی تلسیؔ، کوئی خیّامؔ دو

اور اسی سے آپ یہ بھی اندازہ لگالیں کہ شاگردی استادی کا انسٹی ٹیوشن کوئی کارآمد انسٹی ٹیوشن ہے یا نہیں"۔

مجھے نہیں معلوم کہ ملّا صاحب فنِ شاعری کو فن بھی مانتے ہیں یا نہیں، کیوں کہ اگر

واقعی وہ اِسے فن مانتے ہیں، تو یہ ماننا بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ فن تو سیکھنے ہی سے آتا ہے۔
ملّا صاحب کے دس شعروں کا بھی جس کسی نے انتخاب کیا ہے، تو اُس میں ملّا صاحب کا یہ شعر ضرور شامل کیا ہے :

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

اور ملّا صاحب کو بھی یہ شعر اتنا عزیز ہے کہ اسی پر اُنھوں نے اپنی کتاب کا نام "سیاہی کی ایک بوند" رکھا اور اُس کی رسمِ اجرا وزیرِ اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں کرائی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے تمام لوگوں نے جن میں اُن کے مقدمہ نگار بھی شامل ہیں، ملّا صاحب کا حقِ دوستی نہیں ادا کیا ہے، بلکہ انھیں گمراہ کیا ہے۔ میرے نزدیک اگر ملّا صاحب کا کوئی استاد ہوتا اور وہ یہ شعر اُس کے سامنے لے جاتے تو پہلے تو وہ یہی پوچھتا کہ "جناب کو یہ شعر کہنے کی کیا ایسی ضرورت پیش آگئی جب کہ جوشؔ کا یہ شعر موجود ہے":

بخدا عظیم تر ہے شہدا کے بھی لہو سے
میرے سینۂ قلم میں جو بھری ہے روشنائی

اور پھر بھی اگر ملّا صاحب شعر رکھنے ہی پر اصرار کرتے، تو وہ بتاتا کہ "بھئی، آپ کا شعر اس لیے سقیم ہے کہ آپ نے جہاں پر لفظِ شہید واحد استعمال کیا وہ جمع کا مقام ہے "شہدا، یا شہیدوں" ہونا چاہیے، جیسا جوشؔ ملیح آبادی کے وہاں ہے۔ اور اپنا لال روشنائی والا قلم اُٹھا کر ملّا صاحب کا مصرع کاٹ کے یہ مصرع لکھ دیتا : ع

قیمت میں ہے شہیدوں کے خوں سے بھی کچھ سوا

اور ملّا صاحب کا شعر درست ہو جاتا۔

مجھے افسوس ہے کہ ملّا صاحب نے اپنے ایسے عزیز ترین شعر کو ایسی سقیم حالت میں کیوں رہنے دیا، جب کہ وہ اگر ذرا غور کرتے تو خود بھی درست کر سکتے تھے۔ اور بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد بھی جو وجہ میری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ملّا صاحب کی شاعری کا یہ ایک المیہ ہے کہ اوّل تو انھوں نے کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ بجز تحسین

و آفریں کی آوازوں کے کوئی دوسری آواز کبھی اُن کے کانوں میں گونجی ہی نہیں۔ اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد جب اُردو پر وقت پڑا تو ہُش ہُش اور چُپ چُپ میں اور شدّت پیدا ہو گئی، جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملّا صاحب کا کلام تنقید کی سان پر چڑھنے سے رہ گیا، جب کہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ : ؎

رہ نما نقد ہے، تحسین ہے رہزن مرے دوست
دوست دشمن ہیں مرے، اور ہیں دشمن مرے دوست

یا پھر ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ترقی پسندوں کے گھیرے میں پہنچنے کے بعد ملّا صاحب نے خود ہی زبان کی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا ہو، کیوں کہ ترقی پسند موضوع موضوع کا نعرہ بلند کر کے زبان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ کسی کے شعر میں اگر ذرا بھی زبان کا چٹخارہ پاتے، تو اُس کی ہنسی اُڑاتے اور موضوع وہ اسی کو مانتے تھے جس میں اُن کے مطلب کی بات کہی گئی ہو۔ لیکن وہ تو ایسا اس لیے کرتے تھے کہ زبان و بیان کے معاملے میں کچّے تھے۔ ملّا صاحب اہلِ زبان ہیں اور اُنھیں میں اُن کے جیسا کچّا نہیں سمجھتا۔

جب اُن کی کتاب "میری حدیث عمر گریزاں" شائع ہوئی اور اس پر اُنھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تو اُس وقت تک وہ دلّی منتقل نہیں ہوئے تھے، میں، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور امین سلونوی سب مل کر ملّا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اُس وقت ہمیں لوگ یہاں کی انجمن ترقی اردو چلا رہے تھے اور وہ اُس کے صدر تھے۔ اور عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کے لیے ایک استقبالیہ جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُس روز ملّا صاحب کا نہ جانے کیا موڈ تھا کہ خلافِ معمول وہ ہم لوگوں سے کچھ بہت اونچے سے بات کی، جو ہم تینوں کو کھل گئی، کیوں کہ ہمیں تو وہ لوگ تھے جو ہمیشہ اُنھیں اونچے سے اونچا اُڑاتے رہے، مثل مشہور ہے "پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند"، اُنھیں اٹھانے میں ہمارے شانے دکھ دکھ گئے تھے، آوازیں پڑ پڑ گئی تھیں اور ہمیں سے وہ ایسی باتیں کریں کہ اے وَن استقبالیہ ہو گا تو منظور کروں گا اور اُس میں یہ بھی ہونا چاہیے اور وہ بھی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بات کو یہیں پر چھوڑ کر ملّا صاحب سے پوچھا "اچھا ملّا صاحب یہ تو بتائیے کہ "ع" کے سقوط کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔" اُنھوں نے بے موقع میرے

سوال پر کچھ سکوت کے بعد کہا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے عرض کیا "میں اِس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے آپ کا "ع" گراہوا پایا ہے"۔ کہنے لگے "کہاں سے" میں نے کہا "آپ کی اسی میری حدیث عمر گریزاں سے"۔ میرا جواب سنتے ہی ملّا صاحب فوراً اٹھ کر اندر گئے اور کتاب لاکر مجھے دیتے ہوئے بولے "دکھاؤ"۔ میں نے کہا "دیکھ لیجیے، کتاب کے آخر میں جو غزل چھپتے چھپتے کے عنوان سے چھپی ہے اُسی میں ہے" اور میں نے وہ صفحہ نکال کر کتاب ملّا صاحب کو دے دی۔ ملّا صاحب نے غور سے پڑھا، کتاب بند کردی اور دوسری کتابیں شروع کردیں۔ بہر حال ہمارا استقبالیہ اُنھوں نے منظور کرلیا، لیکن استقبالیہ تقریب میں جو چودھری شرف الدین صاحب کی کوٹھی پر منعقد ہوئی، پڑھنے کے لیے جو تازہ غزل کہہ کے لائے اُس میں شعوری طور پر دو جگہ "ع" گرا کے لائے اور اس اعلان کے ساتھ پڑھا کہ "ع" چوں کہ الف کی آواز دیتا ہے، اس لیے میں اس کے سقوط کو جائز سمجھتا ہوں"۔

میں یہاں یہ لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ملّا صاحب اپنے سہو کا اعتراف کرلیتے جو کبھی اور کسی سے بھی ہوسکتا ہے، تو میری نظر میں اُن کا قد اور بلند ہو جاتا، لیکن جس طرح انھوں نے اپنی غلطی کا دفاع کیا، اُس سے میں نے یہی سمجھا کہ ملّا صاحب جیسی شخصیت جب اپنی ذرا سی کمزوری کو چھپانے کے لیے فن کی سطح سے اتنا نیچے اُتر سکتی ہے، تو پھر کارِ طفلاں تمام خواہد شد کے علاوہ کوئی دوسری صورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ کل کو اردو ہندی الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت کو جائز قرار دینے والا بھی ملّا صاحب کی صف میں آ کھڑا ہوگا۔

میں ملّا صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے اندھیرے سے روشنی میں لے آئے، اور یہ اعلان کر کے کہ اُنھوں نے کبھی کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا، میری ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کردیا، ورنہ آج آنکھ بند کر کے میں اُنھیں مولانا صفی لکھنوی کا شاگرد لکھ دیتا، کیوں کہ ایک موقع پر یہی تاثر میرے دماغ نے قبول کرلیا تھا۔ اور وہ موقع وہ تھا جب بہار ادب کا ماہانہ مشاعرہ خود ملّا صاحب کے گھر ریڈ گیٹ پر منعقد ہوا تھا۔ طرح تھی: "سر اور کہیں، ہاتھ کہیں، پانو کہیں ہے" بہار ادب کے مشاعروں میں قدیر صاحب کو اور مجھے پہلے سے پہنچنا ہوتا تھا۔ چنانچہ قدیر صاحب میرے یہاں آگئے اور ہم دونوں ملّا صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے، راستے میں قدیر صاحب نے

فرمایا "ہر گھر میں ایک اُلّو ہوتا ہے، جو صاحبِ خانہ کہلاتا ہے، ہماری انجمن میں دو اُلّو ہیں، ایک تم اور ایک میں، جو سکریٹری کہلاتے ہیں، کیوں کہ ہر بات کی ذمّہ داری ہمیں دونوں کی اور پھر ہمیں دونوں کچھ نہیں۔" میں نے ان کی تالیف قلب کے لیے کہا "قدیر صاحب ایسا ہے کہ ہم لوگ تو تاج محل کے مزدور ہیں، کہ تاج محل تو ہمیشہ شاہجہاں کا ہی کہلائے گا چاہے ہم لوگ اُسے بنانے میں کتنی ہی اپنی جان کیوں نہ کھپا دیں۔" اور ہم لوگ یوں ہی باتیں کرتے ملّا صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا ملّا صاحب نہیں ہیں، ہال کمرے میں ملازمین انتظام میں لگے ہوئے تھے، ہم لوگ بھی لگ گئے۔ کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ کے بعد ملّا صاحب کے دفتر کا وہ دروازہ کھلا، جو ہال کمرے ہی میں کھلتا تھا اور آگے پیچھے صفی صاحب اور ملّا صاحب برآمد ہوئے اور ہم لوگوں نے معاً یہی تاثر لیا کہ ملّا صاحب اپنی آج کی غزل مولانا صفی کو دکھا رہے ہوں گے۔ صفی صاحب کو بعض دوسرے موقعوں پر سرِ مشاعرہ ٹوکم ٹاکی کرتے بھی دیکھا گیا۔ لیکن صفی صاحب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تو یہ عادت ہی تھی۔ ایک مشاعرے میں جو راجہ صاحب محمود آباد کی زیرِ صدارت انھیں کے محل اقبال منزل میں ہو رہا تھا اور جس کی طرح تھی "مجھ کو پہچانا نہیں شاید مرا قاتل ابھی"۔ جب سراج صاحب کی باری آئی اور اُنھوں نے یہ شعر پڑھا:

یہ جو حرکت میں نظر آتے ہیں پانی کے پہاڑ

کسی نے فرمائش کی "مکرر ارشاد ہو" اور جیسے ہی سراج صاحب نے پہلا مصرع دُہرایا:

یہ جو حرکت میں نظر آتے ہیں پانی کے پہاڑ

کسی نے بلند آواز سے مصرع اُٹھایا:

یہ جو جنبش میں نظر آتے ہیں پانی کے پہاڑ

سراج صاحب نے گھبرا کر مُڑ کے دیکھا، تو صفی صاحب سے نگاہیں چار ہوئیں اور اُنھوں نے فرمایا: "ہاں میاں۔ حرکت تو فعلِ ناشائستہ کو کہتے ہیں۔"

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ اُس زمانے کا کچھ دستور ہی ایسا تھا کہ جسے بھی جو کہنا ہوتا بالاعلان کہتا۔ بہارِ ادب ہی کے ایک سالانہ مشاعرے میں جو

رفاہِ عام کلب میں منعقد ہوا تھا، جب جگر مرادآبادی غزل پڑھتے ڈائس پر تشریف لائے، تو بیٹھتے ہی اُنھوں نے کہا "مطلع میں ایطا ہے اور میں ایطا کو نہیں مانتا۔" آرزو صاحب نے جو میرے پاس ہی تشریف فرما تھے اور کچھ اونچا سننے لگے تھے، ایک ہاتھ اپنے ایک کان پر رکھ کے اور دوسرا کان میرے منھ کے پاس بڑھا کے پوچھا "بھیا، جگر صاحب کیا فرما رہے ہیں" میں نے کہا "فرما رہے ہیں، مطلع میں ایطا ہے اور میں ایطا کو نہیں مانتا" اس پر آرزو صاحب دونوں ہاتھ اور آنکھیں چمکا کر بلند آواز سے جو جگر صاحب کے کانوں تک بھی گئی، بولے "نہیں مانتے تو پھر جو جی چاہے پڑھیں۔"

اثر صاحب کا جب مجموعۂ کلام "بہاراں" شائع ہوا تو وہ خاصا ضخیم تھا۔ اثر صاحب نے جہاں اور رسالے والوں کو بھیجا وہیں "نگار" میں ریویو کے لیے نیاز فتحپوری صاحب کو بھی بھیجا۔ کئی مہینے تک ریویو نہیں چھپا۔ آخر ایک تقریب میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ نیاز صاحب نے فرمایا "اثر صاحب! وہ آپ کا بہاراں مجھے مل گیا تھا، ابھی ریویو شائع نہیں ہوا، لیکن شائع ہو گا۔ آپ نے دو تین شعر واقعی بہت اچھے کہے ہیں۔" اثر صاحب نے جل کے جواب دیا "جی ہاں، وہ غلطی سے شائع ہو گئے ہیں، آئندہ اڈیشن میں نکال دیے جائیں گے۔"

مولانا وصل بلگرامی، لکھنؤ سے ماہنامہ "مرقع" نکالتے تھے، قیصر باغ میں رہتے تھے اور جاپلنگ مارٹ کے ایک کوٹھے پر اُن کا دفتر تھا، جو شہر بھر کے شاعروں، ادیبوں کی آماجگاہ تھا۔ ایک روز وصل صاحب ایک اور صاحب کے ساتھ دفتر میں بیٹھے تھے کہ مولانا بیخود موہانی آ گئے، جو مولانا نیاز فتحپوری کو ابھی صورت سے نہیں پہچانتے تھے۔ وصل صاحب نے کہا "مولانا! آپ بڑے موقع سے آ گئے، میں مولانا نیاز فتحپوری صاحب کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔" بیخود صاحب نے بے ساختہ جواب دیا "مہا گدھا" اس پر وصل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "ٹھیک کہا آپ نے مولانا، اور لیجیے اب اُن سے مل بھی لیجیے، یہی ہیں مولانا نیاز فتحپوری" بیخود صاحب بغیر کسی جھجھک کے بانہیں پھیلائے نیاز صاحب کی طرف بڑھے اور کہا "نیاز صاحب! وہ میری رائے تھی اور یہ میرا اخلاق ہے، آئیے ہم آپ، دونوں بغل گیر ہوں۔" نیاز صاحب نے بغل گیر ہوتے ہوئے مسکرا کے کہا "مولانا! اگر آپ

مجھے خالی گدھا کہتے تو بُرا ماننے کی بات ہوتی، مہا لگا کے آپ نے مجھے بڑا تو بنا ہی دیا۔"

سردار جعفری نے کہیں لکھا ہے کہ اُس زمانے میں لوگ فیشن کے طور پر اپنے آپ کو ترقی پسند کہنے لگے تھے۔ اور اس میں کسی حد تک سچائی بھی ہے کہ ترقی پسند بننا کوئی مشکل بات تو تھی نہیں، میرے دو بیٹے شوکت عمر اور اقبال عمر یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنّفین کے باری باری سکریٹری رہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ملّا صاحب ایک بھرا پُرا کنبہ چھوڑ کر جس میں صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ[1]، ثاقبؔ، ناطقؔ، آرزوؔ، اثرؔ، منظرؔ، سراجؔ، سالکؔ اور عمر انصاری تک کے نام شامل تھے، جو ترقی پسندوں کی آغوش میں جا بیٹھے، تو اُس سے اُنھیں فیض کیا حاصل ہوا۔ کیوں کہ میں تو آج بھی ترقی پسندوں کی جو فہرست بھی اُٹھا کر دیکھتا ہوں، اس میں ملّا صاحب کا نام تو کہیں ڈھونڈے بھی نہیں ملتا، برعکس اُس کے، ہم نے جب بھی کوئی فہرست تیار کی ہے، سرِ فہرست اُنھیں کا نام لکھا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود کو محرومین کی فہرست میں شامل کر کے بھی، اور اِس "پہلے ہم" والے زمانے پر نظر رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ یہی کہا ہے کہ "حضرت پہلے آپ۔"

ترقی پسند تحریک یقیناً ایک بڑی تحریک تھی، لیکن تعداد کے اعتبار سے بڑی تھی، وزن کے اعتبار سے نہیں۔ اور اُس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ اتنی چیخ و پکار کے بعد بھی، وہ نہ ہی کوئی صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ، ثاقبؔ، ناطقؔ اور آرزوؔ ہی پیدا کر سکی، نہ ہی کوئی حسرتؔ[2]، اصغرؔ،

---

[1] یگانہ ہر چند کہ اُس وقت حیدرآباد میں تھے، لیکن انھوں نے لکھنؤ کو خیرباد نہیں کہہ دیا جس کا گواہ اُن کا یہ شعر ہے: ؎

کششِ لکھنؤ ارے توبہ — پھر وہی ہم، وہی امین آباد

[2] کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسرتؔ تو خود ترقی پسند تحریک میں شامل تھے، لیکن حسرتؔ ہوں، جوشؔ ہوں یا خود ملّا صاحب، ان کا تحریک میں شامل ہونا اور بات ہے اور تحریک کا کسی کو شاعر بنا کر پیش کرنا اور بات۔ کسی کے بنے بنائے مکان پر آپ قبضہ کر لیں اور کہیں کہ ہم نے بنایا ہے، تو کون یقین کرے گا۔ ترقی پسند تحریک کی پیداوار وہی شعرا ہیں، جو ۱۹۳۶ء کے بعد تحریک کے پلیٹ فارم سے روشناس ہوئے۔

فانیؔ، جگرؔ، جوشؔ اور فراقؔ۔ لے دے کے اُس کے پاس ایک فیضؔ احمد فیضؔ ہیں تو وہ بھی محض پبلسٹی کے شاعر ہیں، ورنہ ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے سراجؔ لکھنوی۔ اور فیضؔ کی شاعری کا امتیاز بھی بس اسی میں ہے کہ اُنھوں نے لکھنؤ کا آہنگ اور انداز اختیار کیا۔ مثال کے لیے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے اور خود فیصلہ کر لیجیے: ؎

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے (میر انیسؔ)

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے، تو سوئے دار چلے (فیض احمد فیضؔ)

اور اگر اس سلسلے میں کچھ مزید تا حال ثبوت درکار ہو، راقم الحروف خاکسار، ہیچمداں بھی اپنے اشعار پیش کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

فیضؔ صاحب فرماتے ہیں: ؎

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

خاکسار عرض کرتا ہے: ؎

جھونکے کچھ آ گئے، جو کبھی یادِ یار کے
ہمراہ ہو لیا میں نسیمِ بہار کے

فیضؔ صاحب کا شعر ہے: ؎

احساسِ جنوں جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے، تو بھلا کیوں نہیں دیتے

اس ہیچمداں کا شعر ہے: ؎

جن آنکھوں نے دیکھا ہے، اُنھیں آنکھوں سے پوچھو
ہم اس بُتِ کافر کو بھلا کیوں نہیں دیتے

سفرِ زندگی کے اتنے لمبے ساتھ اور رفاقت کا بہرحال یہ صلہ ہے کہ مجھے ملّا صاحب کی

خدمت میں خوش طبعی اور اُن کے ساتھ چھیڑ خانی کی بھی چھوٹ ملی ہوئی ہے جو میں نے خود دے رکھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مضمون لکھتے وقت اِس کا قطعی لحاظ نہیں رکھا ہے کہ اخلاقی باتوں سے گریز کر جاؤں یا اُنھیں ہمیشہ کی طرح چھپائے رکھوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں وہ میرے خلوص پر یقین رکھتے ہیں اور میری شوخ زبانی کا کبھی بُرا نہیں مانتے اور جب شوخ زبانی کا بُرا نہیں مانتے، تو شوخ نگاری کا بھی کیا بُرا مانیں گے۔ مزید برآں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ملّا صاحب جمہوری مزاج رکھتے ہیں، وہ صرف ہاں میں ہاں ملانے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور اختلاف رکھنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ تو میرے سامنے کی بات ہے کہ وہ تو شوکت تھانوی کی اوٹ پٹانگ بھی سہہ لیتے تھے، بلکہ اس پر خوش بھی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ شوکت تھانوی نے لکھا کہ " ملّا صاحب جب مشاعرے میں غزل پڑھتے ہیں تو لگتا ہے ہم امین آباد میں کھڑے ہیں اور تار پر کوّا گھمانے والا، کوّا تار پر گھما گھما کر بیچ رہا ہے۔ کیوں کہ ملّا صاحب کی آواز ویسی ہی نکلتی ہے جیسے تار پر گھومنے والے کوّے کی۔ اس پر ملّا صاحب نے اتنا لطف لیا کہ شوکت کو بلا کر اُن کی فن شناسی کی داد دی اور کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ میری موسیقی کو کوئی سمجھتا ہی نہ ہوگا، لیکن تمہارے تبصرے سے معلوم ہوا کہ ابھی کچھ جانکار موجود ہیں۔"

اپنی غزل سرائی کے سلسلہ میں ملّا صاحب نے خود بھی ایک قطعہ لکھا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اُن کے کسی دوست نے یہ کہہ کے اُنھیں مشورہ دیا کہ آپ ترنّم سے غزل نہ پڑھا کریں، کیوں کہ :

گلے میں ہے آپ کے جو سرگم، کوئی نہیں اُن سروں سے واقف
سمجھنے والا ہی جب نہیں ہے، تو فن دکھانے کی کیا ضرورت

ملّا صاحب قائدِ اردو کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑی ذہانت سے اردو کا کیس تیار کیا اور بڑی مضبوطی کے ساتھ لڑا، اور یہاں تک کہہ دیا کہ :

"میں اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہوں، زبان نہیں۔"

الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کے جج کی حیثیت سے بھی کئی معرکۃ الآرا دو ٹوک فیصلے صادر کیے۔ اور خاص کر پولیس کے بارے میں تو اُن کا ریمارک ہر چند کہ کارروائی کی

دستاویز سے نکال دیا گیا، لیکن لوگوں کے دماغوں میں محفوظ ہے اور ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

ملّا صاحب کی شرافت نفس، عادات واطوار سب نہایت نفیس اور مثالی ہیں۔ اور ورثے میں ایک ایسے شفیق باپ پنڈت جگت نرائن ملّا سے ملے ہیں، جو بذاتِ خود لکھنوی تہذیب اور قومی یک جہتی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے کہ اُنھوں نے آخری سانس بھی لی، تو فرم "احمد حسین ولدار حسین" کے پروپرائٹر احمد حسین صاحب کی کوٹھی پر، اُنھیں کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے، احمد حسین صاحب نے کوئی چال چلی اور قدرے انتظار کے بعد جب کہا "پنڈت جی چال چلیے، کیا سوچ رہے ہیں" تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی تو واقعی چال چل گئے۔

غرض کہ ملّا صاحب میرے لیے ایک ایسی کھلی کتاب کی سی حیثیت رکھتے ہیں، جسے میں گذشتہ نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے پڑھتا ہی رہا ہوں۔ اُنھیں میں نے لکھنؤ کی عدالتوں میں وکالت کرتے بھی دیکھا ہے، جج کی کرسی پر بیٹھے بھی دیکھا ہے، ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے، قائدِ اردو، شاعر، ادیب اور دانش ور کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے اور اسی بنا پر میں یہ کہنے کا منہ رکھتا ہوں کہ: ؎

مجھ سے پوچھے کوئی اُس کا عالم
میں نے دیکھا ہے اُس کا زمانہ

ملّا صاحب کی کئی نظمیں، کتنی ہی غزلیں اور بے شمار اشعار مجھے زبانی یاد ہیں لیکن یہاں چند ہی اشعار پر اکتفا کرنا مقصود ہے: ؎

سب خضر مگر رستہ دو گام نہیں ملتا
ہر موڑ کا اک ساقی اور جام نہیں ملتا

اکیلا غم کی سیہ شب میں خستہ پا انساں
ازل سے جنّتِ گم گشتہ کی تلاش میں ہے

آرزو پوری نہ ہوتی تو نہ ہوتی غم نہ تھا
غم تو یہ ہے، آرزو کا حوصلہ جاتا رہا

تجھ سے او بتا کبھی اے زیست
تجھ کو جی بھر کے پیار ہی نہ کیا

جنّت اُجڑی تو کیا ہم سے، فرشتوں کو بلا
ہم نکالے بھی گئے اور بسائیں بھی ہمیں

قفس کے، دار و رسن کے ہر اک زباں پہ سخن
ترس گئے کہ کبھی آشیاں کی بات چلے

روشنی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں
اِس طرف بھی کچھ سائے، اُس طرف بھی کچھ سائے

امن کی اس جنگ جو دنیا میں سنتا کون ہے
ہر پیامِ صلح، صحرا کی اذاں بنتا گیا

ملّا یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر
کچھ دیں فضائے دہر کو، کچھ لیں فضا سے ہم

انقلاب، اتّحاد، آزادی
کل یہ نعرے تھے، آج نالے ہیں

مل پائے ہیں اب تک، نہ یہ فرزانے ملیں گے
اک روز انھیں روند کے دیوانے ملیں گے

میں کیا سمجھ سکوں ترے آئینِ عدل کو
کانٹوں کا بھی تو ہی تو خدا ہے خدائے گل

دل اعترافِ جرم سے پھر جگمگا اُٹھا
سب داغ دُھل کے اشکِ پشیماں میں آگئے

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملاّ ہی نہ ہو
اِک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

آخر میں اتنا اور عرض کرنا چاہوں گا کہ "مقصدی شاعری" جس کا ترقی پسندوں نے اپنے زمانے میں بڑا شور اُٹھا رکھا تھا، یقیناً اچھی اور مفید شاعری ہے، میں بھی اُس کا قائل ہوں۔ لیکن بڑی شاعری کا درجہ اُسے نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ اُس کی عمر کم ہوتی ہے، مقصد پورا ہوتے ہی اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور وہ محض تاریخ کا ایک حصّہ ہی بن کر رہ جاتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ مقاصد ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں ٹکراؤ بھی رکھتے ہیں اور زمان و مکان کے اعتبار سے مختلف بھی ہوتے ہیں اور بدلتے بھی رہتے ہیں۔ خود ہندوستان ہی میں دیکھ لیجیے کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی صبح کا یہ حال تھا کہ ہم یہ کہہ رہے تھے :-

قدم قدم پہ اندھیروں نے بیڑیاں ڈالیں
طلوع ہو کے رہا آفتابِ آزادی

اور ترقی پسند یہ فرما رہے تھے : ع

چلے چلو، کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ڈاکٹر کمال احمد صدّیقی

پنڈت آنند نرائن مُلّا

[کچھ خیالات]

پنڈت آنند نرائن مُلّا بہ یک وقت میرے پیش رو بھی ہیں اور بزرگ ہمعصر بھی۔ میں اُن کی شاعری کا ہم عمر ہوں۔ ملّا صاحب سے میرے کئی رشتے ہیں۔ استاذی سراج لکھنوی شاعری کی دنیا میں ملّا صاحب سے دس برس پہلے آئے، لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا، دونوں میں برابر کا برادرانہ رشتہ دیکھا۔ دونوں کی ذہنی قربت، بلکہ ذہنی یگانگت اس بات سے واضح ہے کہ سراج چچا نے اپنا مجموعۂ کلام "شعلۂ آواز" کا انتساب "جناب پنڈت آنند نرائن صاحب ملّا لکھنوی اور جناب سیّد صدیق حسن صاحب کے اسمائے گرامی سے کیا۔"

ہر عہد کئی پیڑھیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ملّا صاحب کا سنہ ولادت ۱۹۰۱ء ہے۔ گویا بیسویں صدی سے اُن کی زندگی کا آغاز ہوا (اور توقّع ہے کہ اردو شاعری کا جو کارواں اکیسویں صدی میں داخل ہوگا، اس کے ممتاز علم برداروں میں ملّا شامل ہوں گے)۔ وقت کے ساتھ ماحول، بود و باش، زندگی کے طریقے اور سماج کے ادارے بدلتے ہیں۔ سماجی عوامل بدلتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر ہنر اور فنونِ لطیفہ پر بھی پڑتا ہے۔ ملّا صاحب کی شاعری میں بھی کچھ محسوس اور کچھ نامحسوس طریقے سے نامیاتی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور انھی تبدیلیوں کی وجہ سے وہ کسی ایک رنگِ سخن میں جامد ہو کر نہیں رہے۔ زندگی اور زندگی کی تبدیلیوں سے اُن کی شاعری اثر پذیر ہوتی رہی اور اسی وجہ سے وہ آج تک زائد المیعاد نہیں

ہوئی۔ انسانی قدریں اُنھیں عزیز تھیں اور عزیز ہیں۔ انسانی قدریں ہر عہد میں پامال ہوئی ہیں۔ اُن کی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ سماجی زندگی میں بھی اور انفرادی زندگی میں بھی اور اگر زیادہ توجّہ سے دیکھا جائے تو انفرادی زندگی، سماجی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ ظلم اور جبر کی نوعیت بدلتی رہی ہے اور ظلم اور جبر کے خلاف ملاّ نے بھی اپنی زندگی کے ہر دور میں آواز اٹھائی ہے۔ ملک سے محبّت، کوئی مجرّد تصوّر نہیں ہے۔ ملک سے محبّت کے معنی ہیں ملک میں رہنے والے عوام سے محبّت۔ آزادی کے ہراول دستے کے بعد اردو شاعری کا جو دستہ آیا، اس میں آنند نرائن ملاّ ایک معتبر نام ہے، قومی سطح پر بھی اور مقامی سطح پر بھی۔ قومی سطح کے ساتھ ساتھ مقامی سطح کی بات کرنا، ملاّ کی اہمیت کو کم کرنا نہیں، بالکل حقیقی تناظر میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دلّی کے دبستانِ شاعری اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو مطالعہ کی سہولت کے لیے الگ الگ خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے، لیکن واقعتاً یہ الگ الگ شقیں نہیں ہیں۔ خانِ آرزو دلّی والے تھے، لیکن دلّی کے محاورے پر محاورۂ گوالیار (ایک طرح سے کھڑی بولی پر برج بھاشا) کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ بھی لکھنؤ آ کے رہے۔ انشا تو دبستانِ دلّی کے تھے، لیکن لکھنؤ میں اُن کی شاعری پھولی پھلی۔ اسی لکھنؤ میں انھوں نے کہانی رانی کیتکی کی لکھی۔ سوداؔ اور میرؔ دونوں دبستانِ دلّی کے سربرآوردہ شاعر ہیں، لیکن کیا یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے جیسے جلیل القدر شاعر لکھنؤ آ بسے ہوں اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے ہوں، لیکن اُنھوں نے لکھنؤ کو متاثر نہیں کیا؟ میر ضاحک اور اُن کے بیٹے میر حسنؔ، دلّی سے اودھ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ رام پور، مراد آباد اور امروہہ دلّی کی نواحی بستیاں نہیں تھیں، پھر بھی میرٹھ کی طرح یہ مقامات دلّی سے جڑے ہوئے تھے۔ مصحفیؔ امروہہ کے تھے یا دلّی کے آس پاس کے کسی علاقے کے، اس بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ البتّہ مصحفیؔ نے لکھنؤ کی شاعری کو جو چار چاند لگائے اور جو تذکرے لکھے، اُنھیں لکھنؤ کی ادبی روایات سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ میر انیسؔ، اگرچہ فیض آباد میں پیدا ہوئے، لیکن تھے میر حسنؔ کے پوتے، جنھوں نے ''سحر البیان'' جیسی مثنوی اردو کو دی۔ غالبؔ کا قیام لکھنؤ میں سرسری رہا، وہ آگرہ میں پیدا ہوئے اور دبستانِ دلّی کے عظیم شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری پر سوداؔ، مصحفیؔ اور ناسخؔ

کے اثرات کچھ کم نہیں۔ اور میرؔ کے تو وہ مقلّد ہونے کی حد تک قائل ہیں۔

اردو کی نصابی تنقید میں لکھنؤ کی شاعری، داخلیت کی کم خارجیت کی زیادہ ہے۔ کنگھی چوٹی کی شاعری ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کی شاعری ادبِ عالیہ کا حصّہ ہے، اُن سے الگ بھی لکھنؤ نے شاعری کو نئے رجحانات دیے ہیں۔ اس صدی میں اقبالؔ اردو کا سب سے عظیم شاعر ہے لیکن اقبالؔ کوئی الگ تھلگ PHENOMENON نہیں۔ وہ "موجِ عصر" جو اقبالؔ کی فکر میں حبّ الوطنی، انسان دوستی اور انقلاب بنی، وہی موجِ عصر اکبرؔ الٰہ آبادی، حسرتؔ موہانی، چکبستؔ، جوشؔ، ملّاؔ اور مجازؔ کی فکر کو بھی انگیز کرتی رہی۔ آنند نرائن ملّاؔ نے لکھنؤ سے کنگھی چوٹی اور انگیا کی کٹوریوں کو نہیں چُنا۔ دیا شنکر نسیمؔ، عبدالحلیم شررؔ، چکبستؔ کی عظیم روایتیں بلکہ روایتیں ہی اُن کی میراث تھیں۔ اُنھوں نے اپنی میراث خود چُنی۔ غول کے غوغا نے کبھی کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ روایت سازوں میں علی حیدر نظم طباطبائی، عبدالحلیم شررؔ بھی تھے۔ دلّی میں اگر حالیؔ نے نئی شعریات کی بنیاد رکھی تو لکھنؤ میں شررؔ نے "دل گداز" کے صفحات ہیئت کے نئے تجربوں کے لیے وقف کیے۔ آنند نرائن ملّاؔ کے ہم عصروں میں جوشؔ، صفیؔ لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، سراج الحسن سراجؔ اور جعفر علی خاں اثرؔ جیسی قدآور شخصیتیں بھی تھیں۔ آنند نرائن ملّاؔ نئے لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے ماضی کے خزانے کے انمول رتنوں کو تو اپنی میراث سمجھا، لیکن مرتی ہوئی نوابی کی مرتی ہوئی شاعری کو قابلِ تقلید نمونہ نہیں سمجھا۔

اس عارفی سماج میں، اطلاع کی جگہ اشتہار نے لے لی ہے۔ یہ پُرانے زمانے کی بات ہے کہ مشک وہ ہے، جو خوشبو بتائے نہ عطّار کہے۔ اردو کی ایک کہاوت ہے: چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس کا استعمال دو موقعوں پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جب کوئی چھوٹا، اپنے بزرگ کے بارے میں نازیبا بات کہے۔ ایک اور موقع پر، لیکن کم، اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی اپنے بارے میں تعلّی کرے۔ شاعری میں تعلّی کی اجازت ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کچھ مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ لکھنؤ کی تہذیب ہے۔ اور آنند نرائن ملّاؔ اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعۂ کلام "جوئے شیر" ہے جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

یہ عنوان بھی اُن کو کھٹکا اور خود اُنھوں نے لکھا:

"اس مجموعے کا نام "جوئے شیر" رکھنے میں یقیناً شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ اس میں دکانداروں کا وہ اصول بھی شامل ہے، جو اپنے مال کو دس گنے دام لگا کر گاہک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ گاہک اور دکاندار کے درمیان قیمت کے بارے میں ایک طویل تبادلۂ خیالات ہونے کے بعد سودا طے ہو جاتا ہے۔ گاہک اپنے دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں دکاندار کے بھرّے میں نہ آیا اور میں نے مناسب دام پر مال پایا۔ دکاندار ادھر مطمئن ہوتا ہے کہ اُس نے پھر بھی اچّھا خاصا نفع حاصل کیا۔ میں نے بھی اپنے کھارے پانی کو جوئے شیر کہہ کر پیش کیا ہے......"

"جوئے شیر" کی بات آ گئی ہے تو دو باتیں عرض کر دوں۔ جب کتاب شائع ہوئی، تو اس زمانے میں مَیں مکتبۂ جامعہ سے وابستہ تھا۔ حامد علی خاں مرحوم مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ پروفیسر مجیب اور پروفیسر عابد حسین ڈائرکٹر تھے۔ مکتبہ جامعہ نے پورا اڈیشن خرید لینے کا فیصلہ کیا اور مصنّف سے معاہدہ پر دستخط کرانے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ میں لکھنؤ گیا۔ ملّا صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل تھا، کیوں کہ وہ بھی کبھی کبھی کافی ہاؤس تشریف لاتے تھے اور ڈاکٹر علیم کی میز کے گرد بیٹھنے والوں میں شمولیت کرتے تھے۔ ترقی پسندی کی تحریک اس زمانے میں انتہا پسندی کے دور میں تھی اور دلّی کا جریدہ "شاہراہ" اس تحریک کا غیر سرکاری ترجمان تھا۔ احتجاجی نظمیں لکھنے کا کام میرے سپرد تھا، ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرے لکھنا بھی۔ "جوئے شیر" پر تبصرہ میں نے کیا۔ ملّا صاحب کی انسان دوستی کا تو خیر مقدم کیا، لیکن یہ بھی لکھا کہ ایک سماج، جو طبقوں میں بٹا ہو، اس میں صرف انسان کی حمایت کافی نہیں ہے۔ تبصرہ میرے سامنے نہیں ہے۔ ۴۴، ۴۵ برس کی اپنی ہی عبارت کا ورق حافظے میں پلٹنا ذرا مشکل ہے۔ ذرا مشکل نہیں، ناممکن ہے۔ دھندلا سا تاثر ہے۔ بعد میں عبادت بریلوی نے بھی کچھ ایسی بات ملّا صاحب کی نظم "گمراہ مسافر" کے بارے میں "جدید شاعری" میں لکھی۔ "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں

"کچھ اپنے پڑھنے والوں سے" سے باتیں کرتے ہوئے ملّا صاحب نے عبادت بریلوی کی نقل کی ہے:

"ملّا صاحب کی اس نظم میں سماجی اور تاریخی شعور موجود ہے، لیکن دولت کی مساوی تقسیم سے انھوں نے جو شکوہ کیا ہے، وہاں کچھ جذباتیت آگئی ہے اور یہ بات ملّا صاحب کی صرف اس نظم میں نہیں ہے بلکہ اُن کی شاعری میں اکثر جگہ یہ کیفیت ملتی ہے کہ وہ کسی مخصوص نظام کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ انسانیت پرستی کی منزل تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ محبّت کا پیام بھی دیتے ہیں، لیکن مخصوص نظام کا سہارا نہ لینے کی وجہ سے ایک واضح نقطۂ نظر کی کمی اُن کے یہاں برابر محسوس ہوتی ہے ......"

ملّا صاحب نے خاصی تفصیل اور استدلال کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے، جس کا لبِّ لباب انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"میرے نزدیک کوئی سیاسی نظریہ انسانیت کی مکمّل نمائندگی نہیں کرسکتا اور انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے صرف اشتراکیت ہی ایک راستہ نہیں ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی بھی نظام، جس کی تبلیغ تشدّد اور نفرت سے کی جائے، وہ انسانیت کی راہ میں رہزن ہے، رہبر نہیں۔ اس نظریے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ اشتراکیت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتا، کسی قدر تنگ دلی اور کم نظری ظاہر کرتا ہے......"

یہ موقع ملّا صاحب کے نظریات سے بحث کرنے کا نہیں، لیکن یہ عرض کیے بغیر آگے گزرنا ممکن نہیں کہ وہ نظام جس میں ذرائعِ پیداوار پر افراد کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں اور انسانی محنت کے استحصال سے جو زائد قدر اور منافع پیدا ہوتا ہے، سماج میں سارا ظلم، جبر اور تشدّد انہی کی وجہ سے ہے، چاہے تو واضح نظر آئے یا ڈھکا چھپا ہو۔

اس بات کے بارے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ملّا صاحب ایماندار اور انصاف پسند ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے پولیس کے سب سے بڑے منظّم مجرم گروہ ہونے کے بارے میں جو OBITER DICTUN دیا تھا، اس کی گونج مدّتوں رہی۔ ملّا صاحب نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ایڈوکیٹ کی حیثیت سے بھی اور بنچ پر بھی وہ پولیس کے اُن مظالم کے خلاف جہاد کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے اُن کے ایک BROTHER JUDGE نے ایک بیان میں اس سے اختلاف بھی کیا، لیکن ملّا صاحب کے اس اندازِ بیان نے جو ایک حسّاس شاعر ہی دے سکتا تھا، پولیس کے ضابطوں میں تبدیلیوں کے لیے ماحول سازگار کیا۔ CUSTODIAL RAPES ایک معمول تھا، جو قصبوں اور گاؤں کی کثرت والے ملک میں شاید آج بھی عام ہے۔ لیکن ایسے ضابطے بہر حال بنانا پڑے کہ رات کو کوئی خاتون تھانے یا چوکی پر نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا/ ہے کہ پولیس چوکیاں RED LIGHT AREAS سے بڑے بدکاری کے اڈّے ہیں۔

ملّا صاحب نے جج کے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہوئے ایک نظم کہی تھی، جو اس شعر پر ختم ہوتی ہے:۔

مسند پہ پہنچ کے بھی رہا حامیِ جمہور
ملّا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

رندی، دیوانگی اور کسرِ نفسی ملّا صاحب کا مزاج نہیں، اُن کی فطرتِ ثانیہ نہیں، فطرت ہے۔ ایک چھوٹا واقعہ ہے۔ تیس برس کشمیر میں رہا۔ دو تین چار سال بعد، جب لکھنؤ آنا ہوتا تھا، تو جن کی خدمت میں حاضری دیتا تھا، اُن میں ملّا صاحب بھی تھے۔ گولا گنج میں جب وہ رہتے تھے، تب بھی اور جب بنچ پر تھے تو چاندنا بازار کی کوٹھی پر بھی۔ لکھنؤ کے دوست ایک نشست رکھتے تھے، اکثر ذوالنورین مرحوم کے یہاں، جہاں پر سب سے ملاقات ہو جاتی تھی — حضرت استاذی سراج صاحب، آنند نرائن ملّا صاحب، سیّد صدیق حسن صاحب، ایم۔ ظہیر صاحب وغیرہ۔ ایک بار سردیوں میں گیا تو میرے لکھنؤ میں حاضر ہونے کی خبر اخبار میں چھپی۔ شام کو استاذی سراج صاحب کے بیٹے معراج (مرحوم) آئے اور ملّا صاحب کا پیغام لائے۔ کل چیف کورٹ میں

مشاعرہ ہے۔ میں خود دعوت دینے آتا، لیکن سپریم کورٹ کے سربراہ، مسٹر جسٹس بی۔ بی۔ سنہا آئے ہوئے ہیں، اور میں اُن کے ساتھ مصروف ہوں۔ معراج میری نیابت کر رہے ہیں۔ ضرور تشریف لائیں۔ بڑی شرم آئی کہ ایک بزرگ نے ایسا دعوت نامہ لکھوایا، وہ تو مجھے حکم دے سکتے تھے۔ اگلے روز وقتِ مقرّرہ پر حاضر ہوا۔ بیرسٹر اشتیاق عباسی نے سبزہ زار پر استقبال کیا اور ساتھ لے کر ہال تک آئے۔ مسٹر جسٹس سنہا صدر میں تشریف فرما تھے اور ملّا صاحب اُن کے ساتھ تھے۔ مجھے دیکھا تو دروازے تک آئے اور اپنے ساتھ لے گئے، اور مسٹر جسٹس سنہا سے ملاقات کرائی اور ساتھ بٹھایا۔ یہ خصوصیت سے میرے ساتھ ہی نہیں کیا، جو شاعر بھی آیا، اُس کا استقبال اسی طرح ہوا۔ لیکن جب چیف منسٹر سمپورنا نند آئے (جو اردو میں خفیہ طور پر شعر بھی کہتے تھے) اُن کے استقبال کے لیے ملّا صاحب نہیں اٹھے۔ مشاعرے کے بعد سبزہ زار پر ایٹ ہوم تھا۔ ایٹ ہوم کے بعد ملّا صاحب نے نام بنام ہر شاعر کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں صرف اتنا کہا: "مجھے خوشی ہے کہ بابو سمپورنا نند بھی تشریف لائے"۔

ملّا اور وی۔ کے۔ کرشنا ائیر جیسے اگر دس فیصدی جج بھی سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں میں ہوتے تو ہندوستان کے وہ سارے قانون کالعدم ULTRAVAIRES قرار دیے گئے ہوتے، جن کا نہ دکھائی دینے والا جبر اس ملک کے رہنے والوں کا مقدر بن گیا ہے۔ آریاؤں کے برّصغیر میں آنے سے قبل صرف موہنجوداڑو اور ہڑپا کی دراوڑی تہذیب ہی نہ تھی، بلکہ نگرائڈ، آسٹرلائڈ اور ہند چینی نسل کے اور لوگ بھی تھے۔ آج بھی ان کی اکثریت ہے۔ یہ ادی باسی کہلاتے ہیں، یہی ہریجن کہلاتے ہیں۔ ہمارے آئین میں مساوات کا جو تصوّر ہے، وہ خاص آئین میں کم اور PREAMBLE میں زیادہ ہے۔ اور شیڈول ذاتیں اور شیڈول قبائل بنیادی انسانی حقوق سے یکسر محروم ہیں۔ منڈل کمیشن کی سفارشوں پر گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اس ملک کی اکثریت غریبی کی ریکھا سے نیچے، زندگی کے بنیادی حقوق کے بغیر، کیڑے مکوڑوں کی طرح رہ رہی ہے۔ یہ ظلم اب ڈھکا چھپا، غیر مرئی نہیں، بلکہ واضح ہے۔ اس کی نجات صرف سیاسی تحریکیں ہی دلا سکتی ہیں۔ شاعر ان تحریکوں کا سرگرم کارکن نہ بھی ہو، موردِ الزام نہیں۔ لیکن انسانی مساوات کے لیے اسے آواز تو اٹھانا ہی

پڑے گی، احتجاج تو کرنا ہی پڑے گا۔ ملّا صاحب کے یہاں بھی مدھم لَے اور مدھم سر میں سہی، یہ احتجاج ہے۔ "سماج کا شکار ایسی ہی نظم ہے (جا پوچھ سکھی، شور یہ کیسا ہے گلی میں!)۔ ایک مزدور کا بیٹا، اس پونجی داری یا جاگیرداری سماج میں دھنوان کی بیٹی سے محبت کرنے کا حق نہیں رکھتا، چاہے دھنوان کی بیٹی بھی اُس پر مائل ہو۔ اسی سماج کا شکار وہ کروڑوں لوگ بھی ہیں، جو پہلے اچھوت کہلاتے تھے، پھر گاندھی جی نے اُن کی شناخت برقرار رکھتے ہوئے انھیں ہریجن کہا اور اب شیڈول کاسٹ کہلاتے ہیں۔ ملّا صاحب دولت کی مساوی تقسیم کے بھی خلاف ہیں۔ گاندھی وادی نظریات سے جو ذہنی ہم آہنگی ہے، اس کی وجہ سے شاید وہ سرمایہ داروں کو دولت کا ٹرسٹی سمجھتے ہیں۔ دولت کی مساوی تقسیم کو ملّا صاحب ایک نقاب سمجھتے ہیں جن میں بہ قول اُن کے مہیب اور خونی چہرہ پوشیدہ ہے (میری حدیثِ عمرِ گریزاں: کچھ اپنے پڑھنے والوں سے: ص، ث)۔

ملّا صاحب بہت نڈر انسان اور نڈر شاعر ہیں، بات چبا کر نہیں کرتے۔ روشنائی کی ایک بوند کو شہید کے خون سے اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ اس پر بہت سی بھنویں تنیں اور اُن کی حبّ الوطنی بھی معرضِ خطر میں آئی۔ لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ یہ خیال ایک حدیثِ قدسی میں بھی ہے اور ملّا صاحب علم و آگہی کے خزانے ٹٹولے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تحریک شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں وہیں سے ملی ہو۔

آزادی کا آغاز نہ صرف برِّ صغیر میں خون کے دریا کے اضافے سے ہوا، بلکہ ان علاقوں میں جہاں بول چال کی زبانیں نہیں، زبان ہندی/اردو/ہندوستانی تھی حکومتوں نے اردو کے قتلِ عام کے منصوبے بنائے اور اُن پر سختی سے عمل کیا گیا۔ یو۔ پی نے تین حضرات نے جو اعلیٰ پیمانے کے شاعر تھے، سخت احتجاج کیا۔ حسرتؔ موہانی، فراقؔ گورکھپوری اور پنڈت آنند نرائن ملّاؔ۔ "جوئے شیر" کا انتساب "مٹتی ہوئی اردو" کے نام ہے، اس رباعی کے ساتھ:

اک موت کا جشن بھی منالیں، تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں، تو چلیں

آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت اور گا لیں، تو چلیں

اور فہرست سے پہلے ایک اور رباعی ہے، جو ضرب المثل کے درجے پر پہنچ گئی ہے: "آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ":

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہوا
ہندی کی چھُری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملّا نامی اُن میں شاعر بھی تھا

اسی موضوع سے متعلق ملّا صاحب کا ایک اور بیان ہے:

"میں اپنا مذہب بدل سکتا ہوں، اپنی مادری زبان نہیں"۔

یہ ٹھیک ہے کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست۔ لیکن اس کی عجیب عجیب سے تاویلیں کی گئی ہیں۔ انجمن تحفّظِ اردو یا اسی قسم کی اور انجمنوں کے کم علمی احتجاجی نعرے لگانے والے اگر اس سے مطلب نکالتے کہ ملّا صاحب اپنا مذہب بدلنے پر آمادہ ہیں، مگر اردو کو نہیں چھوڑ سکتے، تو ایک قہقہہ یا تبسّم زیر لب کے ساتھ اس لطیفے کی داد دی جا سکتی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک معروف شخصیت نے، جو ایک یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر، ایک یونیورسٹی میں لسانیات شعبہ کے صدر اور ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ ملّا صاحب کے بیان کی ایسی ہی جماعتی قسم کی تاویل اور تفسیر کی کہ ملّا صاحب اردو کے سچّے عاشقوں میں سے ہیں اور اس کے لیے اپنا مذہب بدلنے کے لیے تیّار ہیں۔ ملّا صاحب، لکھنؤ کی اگلے زمانے کی شرافت کا نمونہ، اس مجلس میں موجود تھے اور انھوں نے یہ گل افشانیِ گفتار اس طرح سُنی جیسے بنچ پر جج، فریقین کے دو وکیلوں کے دلائل سنتا ہے۔ میری زبان یوں بند تھی کہ موصوف کے ساتھ میں بھی مجلسِ صدارت پر تھا۔ ملّا صاحب کے بیان کی جو تاویل فاضل پروفیسر نے کی تھی، درست نہیں۔ جس طرح شیر اپنی کھال کی دھاریاں اور تیندوا اپنی کھال کے بوٹے نہیں بدل سکتا، اسی طرح کوئی اپنی مادری زبان نہیں بدل سکتا، چاہے وہ ہفت زبان ہو جائے یا ہزار زبان ہو جائے۔

ملّا صاحب نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مذہب بھی وراثت میں ملتا ہے، لیکن بالغ اور بالغ نظر ہونے کے بعد یہ اختیاری ہے۔ عقیدوں میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور عقائد بدل بھی سکتے ہیں، لیکن مادری زبان، مادری زبان ہی رہتی ہے۔

ملّا صاحب کی شاعری کے بارے میں اپنے ناقص خیالات ایک طویل مضمون میں پیش کر چکا ہوں، جو شائع ہو چکا ہے۔ اشاعت سے پہلے مسوّدہ میں نے ملّا صاحب کو دکھ دیا تھا اور یہ گزارش بھی کی تھی کہ اگر وہ میرے دلائل سے کہیں شدید اختلاف رکھتے ہوں، تو میں اُن کے نقطۂ نظر کی وضاحت سے خود کو آگاہ کرنا چاہوں گا۔ ملّا صاحب نے مسوّدہ توجّہ سے پڑھا اور فرمایا کہ تم نے اپنے نظریے کے مطابق لکھا ہے اور تمھیں اس کا پورا حق ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ میں اُن کی شاعری کا ہم عمر ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ برابر والے سلوک کرتے ہیں اور اُن کا بڑکپن ہے۔

ایک بار میں کشمیر سے آیا، تو ہائی کورٹ کے بنچ سے سبکدوش ہوئے انھیں زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ چائنا بازار، اُن کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ شام کی کافی پر طلب کیا تھا۔ شعر و شاعری تو خیر ہوئی ہی۔ ایک بات انھوں نے یہ بھی فرمائی کہ صرف سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں میں پریکٹس کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں تو صرف ایک مقدّمہ اس لائق ہے کہ آپ اس کی پیروی کر سکتے ہیں۔ مسکرائے اور فرمایا کہ وہ مقدّمہ میں نہیں لے سکتا۔ کاغذات وہ دیکھ چکے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ سرکار کے مقدّمہ میں جان نہیں ہے اور شیخ عبداللہ بری ہو جائیں گے۔ (پاٹھک صاحب، جو بعد میں نائب صدر جمہوریہ ہوئے، سرکاری وکیل تھے) اور بھی بہت سی باتیں اُنھوں نے بتائی تھیں۔ شیخ عبداللہ کی کتاب "آتشِ چنار" چھپی، تو اس پر لکھنے کے لیے مجھ سے کہا گیا۔ میرا تبصرہ بڑھ کر ایک کتاب ہو گیا (کشمیر: ایک منظر نامہ)۔ میں ایک جگہ دھرم سنکٹ میں پڑ گیا۔ ملّا صاحب نے جو کچھ بتایا تھا وہ نجی طور پر بتایا تھا اور سنجیدہ صحافت ذمّہ داری کی متقاضی ہے۔ قانونی مشیر کو فریق جو کچھ بتائے، وہ PREAMBLE اطّلاع ہوتی ہے۔ اگر ملّا صاحب نے کچھ مجھے بتایا تو وہ مجھ پر اعتماد کر کے بتایا۔ میں نے ملّا صاحب کا نام لیے بغیر ساری باتیں لکھیں، لیکن دل میں کانٹا کھٹکتا رہا کہ نام کے بغیر اس کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت

ختم ہو جائے گی۔ میں نے ملّا صاحب سے رجوع کیا اور اپنے سنکٹ کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ میں مسودہ آپ کو دوں گا، آپ اس کا جائزہ لیں۔ بات، جس اسلوب میں آپ چاہیں گے، میں دوبارہ لکھ دوں گا۔ ملّا صاحب کی وسیع القلبی کی یہ وہ مثال ہے جو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مسوّدہ کئی روز اُن کے پاس رہا۔ کوئی بہت بڑی تبدیلی تو اُنھوں نے نہیں کرائی، نفسِ مضمون باقی رہنے دیا، البتّہ الفاظ میں اُنھوں نے ترمیم کا مشورہ دیا۔ ملّا صاحب جانتے تھے کہ اگر وہ اس ذکر کو حذف کر دینے کی خواہش کرتے تو میں اس خواہش کا احترام کرتا۔

اجازت لینے سے پہلے میں ایک بار پھر اس توقع کا اظہار کروں گا کہ جو ادیب اردو کا کارواں اکیسویں صدی میں لے جائیں گے، ان میں پنڈت آنند نرائن ملّا بھی ہوں گے۔

*****

پروفیسر ولی الحق انصاری

عہدِ مُلّا کا لکھنؤ اور لکھنوی شاعری

نوابینِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں جو شعری روایات قائم ہوئی تھیں وہ لکھنؤ میں نوابی دور کے خاتمے کے بعد بھی برقرار رہیں اور موجودہ صدی میں بھی لکھنؤ اپنی شاعرانہ حیثیت اور انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، البتّہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ یہاں کی شاعری میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ غیر لکھنوی شاعروں کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

کچھ عرصے قبل تک لکھنوی شاعری کو بدنام کرنا ایک فیشن سا بن گیا تھا۔ اسے گل و بلبل کے افسانوں، کنگھی چوٹی کی داستانوں اور رکیک مضامین کی ادائیگی تک محدود سمجھ لیا گیا تھا لیکن اس قسم کے الزام لگانے والے شاید اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے تھے کہ شاعری کے یہ عناصر اہلِ لکھنؤ کو انھیں شاعروں سے ملے جنھیں فخریہ انداز میں استادانِ دبستانِ دہلی کہا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ کی عیش پرور فضا میں اس قسم کی شاعری کچھ زیادہ مقبول ہو گئی چناں چہ یہاں کے شاعروں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجّہ کی۔ لکھنوی شاعری کا طرّۂ امتیاز وہ مضامین نہیں ہیں جنھیں یہاں کے شعرا نے اپنے کلام میں ادا کیا ہے بلکہ وہ زبان ہے جس میں یہ خیالات ادا کیے گئے ہیں اور اسی پاکیزگیِ زبان نے لکھنوی شاعری کو ایک علاحدہ دبستانِ شاعری کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع دیا۔

اصلاحِ زبان کی ابتدا شیخ امام بخش ناسخ اور انھیں کے ساتھ خواجہ حیدر علی آتش نے کی اور ان کے بعد بھی ان کے شاگردوں کے ذریعہ یہ سلسلہ جاری رہا اور ان کی سعی سے نہ صرف لکھنؤ میں بلکہ اس کی تقلید میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں وہ زبان رائج اور مقبول ہوئی جو اپنی شیرینی اور حسن میں بجا طور سے قند پارسی کا جواب کہی جا سکتی ہے۔ ان شعرا کے کلام میں خیالات البتہ محض روایتی ہیں جن کا حقیقت پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ بات صرف لکھنوی شاعری تک محدود نہیں ہے۔ یہی اس عہد کی شاعری کا عام رنگ تھا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، لکھنؤ کے عیش پسند ماحول نے اس میں صرف کچھ اضافہ کر دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس رنگ کو مقبول اور اجاگر کرانے والے لکھنوی شاعروں سے زیادہ داغ دہلوی تھے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ داغ کی اس شاعری کی مقبولیت کے بدولت جس پر رکاکت اور ابتذال کی گہری چھاپ ہے رسا بند لکھنؤ خصوصاً امیر مینائی، بھی وہی رنگِ شاعری اختیار کرنے پر مجبور ہوئے جسے سبکِ داغ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عہد میں بھی اساتذۂ لکھنؤ کی اصل توجہ زبان کی درستگی کی طرف زیادہ رہی جس کی مثال میں امیر مینائی اور ان کے شاگردوں، خصوصاً ریاض خیرآبادی کی شاعری اور جلال لکھنوی کی نثری تصانیف کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کا نوابی دور ختم ہو گیا اور اسی کے ساتھ وہ عیش پسندانہ ماحول بھی ختم ہوا جس کے نتیجہ میں وہ مبتذل شاعری وجود میں آئی جس کے لیے بغیر سمجھے بوجھے آج بھی لکھنؤ کو مطعون کیا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی لکھنوی شاعری کے عناصر بھی عشق و محبت رہے لیکن پُرکنیت اور رجان صاحبیت ختم ہو گئی البتہ ابتذال کچھ حد تک باقی رہا جس کا ایک سبب سبکِ داغ کی مقبولیت بھی تھا۔ اس دور میں حالات کی ناسازگاری کے ساتھ ساتھ حالی کی اصلاحی تحریک کا بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر لکھنوی شاعری پر اثر پڑا اور وہ شعرا جنھیں عہدِ ملا کا پیش رو کہا جا سکتا ہے وہ بھی کچھ حد تک اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس دور کے شعرا میں امیر مینائی کے شاگرد اور لکھنؤ اسکول کے ایک اہم شاعر ریاض خیرآبادی (۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۲ء) ہیں۔ جہاں تک ان کے سبک کا تعلق ہے، وہ اپنے استاد کے علاوہ داغ دہلوی اور جلال لکھنوی سے بھی متاثر ہیں چنانچہ دونوں کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔ جہاں تک لطفِ زبان کا تعلق ہے انھیں یگانہ

عصر کیا جاسکتا ہے لیکن شوخی و رندی میں وہ داغؔ کے پیرو نظر آتے ہیں لیکن یہ رندی خمریات تک محدود ہے اور اس رنگ کلام کا انھیں لکھنؤ اسکول کا آخری شاعر سمجھنا چاہیے۔ نموتناً ان کے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں : ؎

شعر میرے تو چھلکتے ہوئے ساغر ہیں ریاضؔ — پھر بھی سب پوچھتے ہیں آپ نے پی ہے کہ نہیں
چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی
محتسب آیا تو میں خم پر گرا — خم گرا ، مینا گرا ، ساغر گرا
اتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی — گرہ میں دام نہ ہوں گے، ادھار پی ہوگی
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش — سُن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا
وہ جانا مرا روٹھ کر میکدے سے — صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا
مل جائے تو شراب کا دریا بہائیں ہم — اللہ دے اگر تو پییں اور پلائیں ہم
اچھی پی لی، خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی
کالی گوری کوئی نہ چھوڑی — افیون کھائی شراب پی لی
جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو — یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے
چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھالیے — اب کیا کھینچتے کہ تاک کا حاصل نکل گیا

خمریات کا ایک دوسرا رُخ ملاحظہ ہو : ؎

اتری تھی آسمان سے جو کل، اٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل تو اٹھا لا
سنا ہے ریاضؔ اپنی داڑھی بڑھا کر — بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں
اہلِ حرم بھی آج ہوئے ہیں شریک دور — کچھ اور آج رنگ مری میکشی کا تھا
اپنی یہ وضع اور یہ دشنامِ مے فروش — سُن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا
میرا بھی یہ خیال ہے گو میں نے پی نہیں — کوئی حسین پلائے تو یہ شے بری نہیں
وہ جانا مرا روٹھ کر میکدے سے — صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا
اس شیخ کہن سال کی اللہ رے بزرگی — جنّت میں بھی جاکر یہ جوان ہو نہیں سکتا

ریاضؔ کی شاعری کا آہنگ بلاشبہ رندانہ تھا لیکن ریاضِ رضوان میں ایسے اشعار کی بھی

کمی نہیں جن میں شوخی کے علاوہ اعلا پایہ کی سنجیدگی پائی جاتی ہے مثلاً

تری گلی میں نشانِ مزار باقی ہے ۔۔۔ غبارِ راہ مری یادگار باقی ہے

کتنے کعبے ملے رستے میں، کئی طور ملے ۔۔۔ ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے ۔۔۔ جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

کیوں جوانی آئی دو دن کے لیے ۔۔۔ دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

وہاں میکشی مے پرستی رہی ۔۔۔ یہاں عمر بھر فاقہ مستی رہی

لحد پر اُگا بھی جو سبزہ کبھی ۔۔۔ گھٹا بن کے حسرت برستی رہی

دور ہو تو دوا کرے کوئی ۔۔۔ موت ہی ہو تو کیا کرے کوئی

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا ۔۔۔ تم ہنس پڑے، یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

متذکرہ بالا اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت ملّا صاحب نے شاعری کا آغاز کیا اس وقت پاکیزگیِ زبان کے علاوہ خیالات کے معاملے میں بھی لکھنوی شاعری ایک نئے موڑ پر کھڑی ہو چکی تھی۔

عہدِ ملّا کے ابتدائی دور کے معاصرین میں صفی لکھنوی اور چکبست لکھنوی وہ حضرات ہیں جنھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور سے حالی کا نظریۂ شعر قبول کیا یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ تنگنائے غزل سے باہر آ کر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نظموں کا سہارا لینا پڑا۔ چکبست وطنی شاعر تھے اور صفی ملّی، چناں چہ ملّا صاحب سے پہلے لکھنؤ میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ چکبست کے وطنی لیڈروں کے مراثی اور صفی اور ان کے شاگرد عزیز لکھنوی کی ملّی نظمیں ہیں۔ ان تینوں شاعروں نے (مرثیہ نگاروں کے علاوہ) نہ صرف لکھنؤ میں نظم گوئی کا آغاز کیا بلکہ لکھنؤ کی غزل کی بھی ایک نئی سمت متعیّن کی۔ ان سے قبل اگرچہ رکاکت وابتذال کے عناصر لکھنوی شاعری سے ختم ہو چکے تھے لیکن غزل کے خاص موضوع حسن وعشق، سراپائے محبوب اور رندانہ خیالات کا اظہار تھا جیسا کہ ریاض خیرآبادی کے سلسلے میں کہا جا چکا ہے۔ چکبست، صفی، عزیز اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ نے غزل کے مضامین میں وسعت اور تنوّع پیدا کرنے کی کوشش کی بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہی حضرات تھے جنھوں نے

حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ سے بھی پہلے غزل کو معنوی آہنگ بخشا اور لطافتِ زبان (جو لکھنوی شاعری کا ہمیشہ طرّۂ امتیاز رہی ہے) کے ساتھ ساتھ رفعتِ خیال اور ندرتِ اظہار کو بھی غزل کا لازمی جز بنا دیا اور اس معاملے میں یہ سب حضرات لکھنؤ اسکول کے اساتذہ ہونے کے باوجود سبکِ غالبؔ سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں اور اس معاملے میں وہ خود غالبؔ کے وطن کے شاعروں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں اور اگر غالبؔ یہ کہتے ہیں: ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تو چکبستؔ کہتے ہیں کہ: ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب　　موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ملّا صاحب کے سینیر معاصرین میں صفیؔ اور عزیزؔ کا دور ایک ہنگامہ آرائی کا دور ہے۔ اس دور میں لکھنؤ سے باہر سے آکر لکھنؤ میں بس جانے والے اور خاص لکھنؤ کے شاعروں میں شاعرانہ ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ اس گروہ بندی میں ایک طرف صفیؔ اور عزیزؔ صاحبان تھے اور دوسری طرف یگانہؔ، بیخودؔ اور افقرؔ موہانی۔ آخرالذکر حضرات لکھنوی نہ ہونے کے باوجود لکھنؤ کا اسی طرح حصّہ بن چکے تھے جیسے آتشؔ و ناسخؔ اور لکھنؤ کے لیے باعثِ فخر تھے اور یہ صرف بدقسمتی ہے کہ انھیں یہ احساس رہا کہ اہلِ لکھنؤ انھیں لکھنوی نہیں سمجھتے، یہ احساس یگانہؔ چنگیزی میں سب سے زیادہ تھا اور اسی کے تحت انھوں نے عمر میں اپنے سے بڑے لکھنوی شاعروں پر نہ صرف اعتراضات کیے بلکہ غیر شایستہ الفاظ بھی استعمال کیے مثلاً آیاتِ وجدانی کے خوش نوشت دیباچے میں حضرت صفیؔ لکھنوی کو خفیؔ اور حضرت عزیزؔ لکھنوی کو ذلیل کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی یہی انانیت آخر عمر میں ان کی رسوائی کا باعث بنی۔ ان کی تحریروں سے البتّہ اس بات کی طرف ضرور دماغ متوجّہ ہوئے کہ لکھنویت کے لیے محض لکھنؤ میں پیدا ہونا لازمی نہیں۔ یہاں کے ادبی ماحول میں جو بھی آکر گھل مل گیا اسے اس سرزمین اور اس کے مکتبۂ شعر کا شاعر سمجھنا چاہیے اور اس لحاظ سے یگانہؔ، بیخودؔ، افقرؔ، آسیؔ وغیرہ حضرات کو بھی اسی طرح لکھنوی سمجھنا چاہیے جس طرح بانیانِ مکتبۂ لکھنؤ یعنی آتشؔ و ناسخؔ کو لکھنوی سمجھا جاتا ہے۔ باہر سے لکھنؤ آنے والے ان شعرا نے جو سب کے سب اسی سرزمین میں پیوندِ خاک ہوئے، لکھنوی شاعری کو بہت کچھ

دیا جس کو دبستانِ لکھنؤ کی شاعری سے ہٹ کر کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ان شاعروں کے کلام میں بھی وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو لکھنوی شاعر کا طرّۂ امتیاز ہیں یعنی زبان کی صفائی و شستگی، تراکیب کی درستی اور ندرتِ بیان۔ ان حضرات کے کلام میں بھی ان کے خالص لکھنوی معاصرین کی طرح معنویت کی طرف زیادہ توجہ ہے اور ان کا کلام بھی رکاکت کے اس الزام سے پاک ہے جس کا نشانہ لکھنوی شاعری بنتی رہی۔ اس عہد کے تمام لکھنوی شعرا، خواہ وہ خالص لکھنوی ہوں یا باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہوں، کی محبوب ترین صنفِ غزل تھی اور عشق و محبّت اس کے خاص موضوع تھے لیکن لیکن ان مضامین کے اظہار کا طریقہ انتہائی پُروقار ہو چکا تھا۔ فصاحتِ کلام اور لطافتِ زبان اس دور کے شعرا کے بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہے ہے لیکن محض زبان کے لیے شعر کہنا یا اس کے لیے خیال کو قربان کر دینا، جو نوابی دور کے آخر میں لکھنؤ میں رُواج پا چکا تھا، تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ رعایتِ لفظی اور صنّاعی کی طرف اب بھی توجّہ تھی لیکن محض صنعتوں کے لیے شعر کہنا بند ہو چکا تھا۔ گل و بلبل کی داستانیں اس عہد کی غزل میں بھی بیان ہوتی رہیں لیکن یہ اندازِ بیان اعلا خیالات کو بیان کرنے کے لیے صرف تخیلی اور استعاراتی تھا۔

لکھنوی شاعری کے اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسائلِ رُوزگار اور معاملاتِ زندگی کو بھی غزل کے پاکیزہ انداز میں بیان کیا جانے لگا اور، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ان مضامین کی ادائیگی کے لیے صنفِ نظم کو بھی کام میں لانا شروع کر دیا گیا تھا اور اسی ماحول نے ملّا صاحب کو ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ نظم گو شاعر ہونے کی حیثیت سے پروان چڑھایا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لکھنوی شاعری کے مذکورۂ بالا دور کا آغاز صفی اور چکبست نے کیا لیکن ان سے بھی پہلے مرزا ہادی رسوا (۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۱ء) اس صنف کو وقار بخش چکے تھے۔ مرزا رسوا کو اپنے وقت کا جینیس سمجھنا چاہیے۔ انھیں مختلف علوم و فنون پر مکمّل عبور حاصل تھا اور اگرچہ ان کی شہرت بحیثیت نثر نگار سمجھی جاتی ہے لیکن وہ ایک بلند مرتبہ غزل گو بھی تھے۔ انؔ کے کلام کے چند نمونے پیش ہیں، ؎

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدّت پسند　　پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

شکووں میں بھی انداز نہ ہو حسنِ طلب کا ہاں اے دلِ بیتاب رہے پاس ادب کا
کہیں ہم اب کچھ ایسے شعر مرزاؔ جن میں جدّت ہو کہاں تک حاشیے لکھا کریں غالبؔ کے دیوان کے
غمِ جاوید یعنی دردِ فرقت میرا حصّہ ہے عدو نے بات ہی کھوئی شریکِ امتحاں ہوکر
رگ و پے میں سمایا عشق و ربطِ جسم و جاں ہوکر رہی یہ آگ میری تن میں مغزِ استخواں ہوکر
رکھتے ہیں حسنِ ظن یہ بتوں کی وفا سے ہم جیسے کہ مانگتے ہیں دعائیں خدا سے ہم
ناخنِ وحشت نے سینے پر جو کیں گلکاریاں فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں
چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل اب سنا مرزاؔ کہ وردِ اہلِ عرفاں ہوگئیں
تنگیِ عیش میں ممکن نہیں ترکِ لذّت سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقوں میں مزا دیتے ہیں
فرشتو جب کسی سے ہو وقوعِ سعیِ لاحاصل مرے اعمال میں لکھ دو، وہ محنت رائیگاں کیوں ہو
جیتے جی اس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں لذّتِ غم نہ رہی غیر کے مرجانے سے
کس قدر معتقدِ حسنِ مکافات ہوں میں دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
جس کو برسوں ہنسی نہ آئی ہو اس کو ناصح کی بات پر آئے
لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

مرزا رسواؔ کے جونیر اور ملّا صاحب کے سینیر معاصر پنڈت برج نرائن چکبستؔ (پیدائش: ۱۸۸۲ء، وفات: ۱۹۲۶ء) نے نہ صرف جدید نظم سے لکھنوی شاعری کو روشناس کرایا بلکہ غزل کو بھی ایک شستہ لہجہ عطا کیا، جس میں زبان کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ خیالات کا وقار بھی شامل تھا جس کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں لکھنؤ کی شاعری کی ارتقائی شکل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ –

نیا مسلک، نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں
کچھ ایسا پاسِ غیرت اٹھ گیا اس دورِ پُرفن میں کہ زیور بن گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں
وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو اُنس باقی ہے مزہ دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں
زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
چمن کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے بلبل — گلوں سے پھوٹ کے رنگِ خزاں نکل آیا
پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے — شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا
فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کے لیے — بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے
جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں کم مائیگی دل کی — نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

چکبست کا مجموعۂ کلام صبحِ وطن ان کے نظموں پر مشتمل ہے جن میں حب الوطنی، خدمتِ خلق، خواہش معاشرت وغیرہ موضوعات پر ان کی نظمیں ملتی ہیں۔

چکبست کی شاعری (غزل اور نظم دونوں) اگر جذبۂ وطنیت کی آئینہ دار ہے تو ان کے معاصر صفی (پیدائش: ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء، وفات: ۱۹۵۰ء) کی شاعری پاکیزہ عشق کی کیفیتوں اور ملی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ لکھنوی شاعری میں نظم گوئی کی ابتدا انھوں نے چکبست سے بھی پہلے کی تھی جب جنگِ عظیم کے دوران ان کی مشہور ملی نظم شائع ہوئی جس کے تین اشعار درج ذیل ہیں: ؎

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے — مشرق کا سرا لے کر مغرب سے ملا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے — اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا — یہ نظمِ صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

صفی کی نظم گوئی غالباً حالی کی تلقین کے زیرِ اثر شروع ہوئی اس لیے کہ صفی کے کلام میں خود حالی کا ایک مرثیہ بھی ملتا ہے۔ لیکن صفی نے باقاعدہ ملی نظمیں ۱۹۳۷ء یعنی ملازمت سے رٹائر ہونے کے بعد کہنا شروع کیں۔ ان نظموں میں جو عموماً مسدس کی شکل میں ہیں قومی عناصر کے ساتھ ساتھ ملکی اور سیاسی عناصر بھی شامل ہیں۔ نیز ان میں ان مقامات کی بھی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے جہاں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ صفی کی زندگی میں یہ نظمیں "لختِ جگر" کے عنوان سے شائع ہو چکی تھیں۔ نظموں کے علاوہ صفی کی غزلیں بھی اس معنی میں انتہائی اہم ہیں کہ لکھنوی غزل کو مقصدیت کی طرف موڑنے میں صفی کا سب سے

زیادہ حصّہ ہے۔ عام طور سے ان کی غزل کے اشعار بھی ان کے پیش رووں کی طرح عشق کے محور کے گرد گھومتے ہیں لیکن ان کا اندازِ بیان ہوس کی آمیزش سے قطعاً پاک ہے۔ "گل و بلبل" ان کے یہاں بھی ہیں لیکن وہ عموماً استعاراتی اندازِ بیان ہے اور محض سمبل کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اپنے پیش رووں کے برخلاف انھوں نے عموماً تکلّف، تصنّع، خارجیت سے احتراز برتا ہے اور رسمی مضامین کے بجائے دلی کیفیتوں کو سلیس و فصیح زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے عہد کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں ترنّم سے پڑھنے کا طریقہ رائج کیا۔ صفی کی غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں :-

ڈر ہے مجھے کہ رشتۂ الفت نہ ٹوٹ جائے
تسبیح سے کشاکشِ زنّار دیکھ کر

کوئی زہر پی بھی لیتا تو وہ دل لگی سمجھتے
کوئی جان دے بھی دیتا تو نہ اعتبار ہوتا

مری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

نہ خاموش رہنا مرے ہم صفیرو
جب آواز دوں تم کو، آواز دینا

کاشانۂ گدا ہو یا قصرِ بادشاہی
یہ بھی خراب ہوگا وہ بھی خراب ہوگا

کیا کروں اب جو عطا ساغرِ خم ہوتا ہے
وقت وہ ہے کہ مسرت سے بھی غم ہوتا ہے

ضو جتنی بڑھتی جاتی ہے شمعِ شعور کی
نزدیک ہوتی جاتی ہے ہر چیز دور کی

کل ہم آئینہ میں رخ کی جھرّیاں دیکھا کیے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

گھٹا اٹھی ہے کالی، اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے، خالی ہوتی جاتی ہے

وضعِ صفی نہ پوچھو اک رندِ پارسا تھا
لب پر صنم صنم تھا دل میں خدا خدا تھا

ذرّے ذرّے میں ہے جلوہ تری یکتائی کا
دلِ انساں میں جو ہو شوق شناسائی کا

کچھ اس سے بحث نہیں یہ کلام ہے کس کا
سخن شناس سخن کے اثر کو دیکھتے ہیں

سرِ راہ خاک اڑاؤ مگر اک ذرا سمجھ کے
کس دل کے آئینہ پر نہ صفی غبار آئے

دل میں رکھیے تو کدورت کہلائے
منھ سے نکلے تو شکایت ہوگی

چلیے مگر آہستہ، یہ عشق کی منزل ہے
ہر جادہ رگِ جاں ہے ہر ذرّے میں اک دل ہے

طریقِ عشق میں جب راہِ ناہموار ہو پیدا — تو لازم ہے زیادہ گرمیِ رفتار ہو پیدا

پائے قاتل پہ غیر کا سر تھا — یہ بھی کمبخت کا مقدّر تھا

جانا جانا، جلدی کیا ہے ان باتوں کو جانے دو — ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

اک اک سے الجھتا ہے اپنا ہو کہ بیگانہ — پوچھو نہ روش دل کی، دیوانہ تو دیوانہ

دل نے درد آشنا کیا مجھ کو — دل کو صبر آزما کیا میں نے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے — آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

ملتے ہی آنکھ دل پہ قیامت گزر گئی — جادو بھری نگاہ صفیؔ کام کر گئی

دیکھیے کیوں، کوئی تربت ہوگی — دیکھ کر اور ندامت ہوگی

ان اشعار کا مطالعہ، بقول مرزا جعفر حسین، ان کی زبان دانی، لطفِ بیان، رنگِ تغزل، سلیقہ مندی اور ان کے کمالِ فن کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت کو ان کے تحقیقی مقالے "صفی لکھنوی۔ حیات اور شاعر" پر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ مل چکی ہے۔

صفیؔ کے خالص لکھنوی معاصرین یعنی عزیزؔ، ثاقبؔ، آرزوؔ، حکیم ناطقؔ وغیرہ نے بھی زبان و بیان کے سلسلے میں صفیؔ ہی کی روش اختیار کی اور غزل میں خارجی عناصر کے اظہار سے زیادہ داخلی کیفیتوں کے بیان کو ترجیح دینے کے ساتھ ساتھ ان روایاتی مضامین کو بھی ترک کر دیا جس کے لیے لکھنوی شاعری بدنام تھی۔ ان حضرات کے کلام میں نہ تو بے کیف مبالغہ آرائی ملے گی، نہ محبوب کا مضحکہ خیز سراپا، نہ گھسی پٹی تشبیہیں، نہ ذو معنی الفاظ جن میں ذم کا پہلو موجود ہو، نہ ہوس پرستانہ جذبات کا اظہار۔ ان تمام باتوں کے برخلاف عشق کی پاکیزہ داخلی کیفیات، حسن کا پاکیزہ بیان، عام انسانی مسائل پر اظہارِ خیال، آورد کے بجائے آمد، تخیل میں بلند پردازی، زبان میں سوز و گداز، سوقیت کی متانت، عریانی کے عوض تہذیب و شائستگی اس دور کے تمام لکھنوی شعرا کے خصوصیاتِ کلام ہیں۔ شعر میں علمی و فکری عناصر، معنی آفرینی اور رعنائیِ فکر و خیال وہ خصوصیات ہیں جن کی طرف اس عہد کے شعرائے لکھنؤ خصوصاً عزیزؔ اور ان کے بیرونی معاصرین یعنی بیخودؔ موہانی اور یگانہؔ چنگیزی نے خاص توجہ کی۔ اصلاحِ زبان دبستانِ لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت رہی ہے۔ اس عہد میں بھی اساتذۂ لکھنؤ نے اس کی طرف

اپنی توجہ برقرار رکھی اور بہت سے مفرد الفاظ میں جو حروفِ زائد تھے وہ خارج کر دیے گئے مثلاً "کاشکے" کے بجائے صرف "کاش"، "سکھلانا" کے بجائے "سکھانا"، "آوے" "جاوے" کے بجائے "آئے" "جائے" "ہیگا" کے بجائے "ہے" رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان خصوصیات کا اندازہ لگانے کے لیے اساتذۂ لکھنؤ کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن کا انتخاب کسی خاص کاوش کے بغیر کیا گیا ہے۔

عزیز لکھنوی (پیدائش ۱۸۸۲ء، وفات ۱۹۳۵ء) صفی کے شاگرد اور خود مرتبہ استادی پر فائز جوش و اثر کے ایسے عظیم شاعروں کے استاد تھے۔ دبستانِ لکھنؤ میں لکھنوی شاعری کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے غالب کی پیروی کرنے والا انھیں اولین شاعر شمار کرنا چاہیے۔ نمونتًا ان کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں۔ غزلوں کے علاوہ بحیثیت نظم نگار بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ عزیز کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

حیرت فروشِ جلوۂ دلبر کے ہو گئے
بُت، اک نگاہ پڑتے ہی، پتھر کے ہو گئے

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے
تیرے ہر انداز کو چھپ کر کوئی دیکھا کیا

مرے بعد آنے والے سر دھنیں گے جس کے مطلب پر
لکھے جاتا ہوں ایسی بات اِک دیوارِ زنداں پر

کہنا کسی کا وصل کی شب بھولتا نہیں
اب سو رہو عزیز، بہت رات ہو گئی

نیا نیا جو کسی شوخ کا شباب آیا
اٹھا کے آئینہ دیکھا تو خود حجاب آیا

دم الٹ جائے گا، عزیز عزیز
رہ نہ خاموش کچھ تو باتیں کر

رشک سے روح پہ بیداد کیا کرتے ہیں
روک کر سانس انھیں یاد کیا کرتے ہیں

فرصتِ زیست کم ہے، کام بہت
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

دنیا کو مٹایا ہے اسی طرزِ عمل نے
جو دل میں ہمارے ہے زباں پر وہ نہیں

ظاہرا بیہوش، باطن میں سراپا ہوش ہوں
دیکھتا جاتا ہوں رنگِ محفل اور خاموش ہوں

شیشۂ دل کو یوں نہ اٹھاؤ
دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

اے سوزِ عشقِ پنہاں، اب قصّہ مختصر ہے
اکسیر ہو چلا ہوں اک آنچ کی کسر ہے

کھلتا ہی نہیں فریبِ ہستی
کچھ بھی نہیں، اور کیا نہیں ہے

سینے میں اک جہنّم آنکھوں میں ایک طوفان
کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا

دنیا کا رنگ دیکھتے جاتے ہیں غور سے
شکوہ کبھی کریں گے جہاں آفریں سے ہم

زخموں سے دل کا عالم کیا پوچھتے ہو کیا ہے
گلزارِ بے خزاں ہوں، دنیائے رنگ و بو ہوں

لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کو عزیز لکھنوی سے متعلّق ان کے تحقیقی مقالے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔

ثاقب لکھنوی (پیدائش ۲، جنوری ۱۸۶۹ء، وفات ۱۹۴۶ء) اکبر آباد میں پیدا ہوئے لیکن آبروئے لکھنؤ ہوئے کلام نمونتًا پیش ہے۔ کلّیات شائع ہو چکا ہے۔

اک عمر کاٹ دی ہے سوادِ گناہ میں
دھوتا ہوں شب کو بیٹھ کے داماں کبھی کبھی

وہی ذاتِ باری کو پہچانتا ہے
جو اپنی حقیقت کو خود جانتا ہے

گوہرِ مدعا نہیں ملتا
ہم نے دنیا کی خاک چھانی ہے

غنی ہے دل تو شکوۂ سکندری کیا ہے
تجھے خبر نہیں شانِ تونگری کیا ہے

سوائے اس کے کہ ہاتھوں کا ہے نشیب و فراز
کسی فقیر پہ منعم کو برتری کیا ہے

فدائے حسنِ معانی ہیں جوہریِ کلام
یہی نہیں تو کمالِ سخنوری کیا ہے

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

اپنے ہی دل کی آگ میں آخر پگھل گئی
شمعِ حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی

تڑپا دیا ہے دل کو، شاباش ہم صفیرو
یوں ہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس، چلا میں

ہے روشن قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبّت کا صلا دینے لگے

ہجر کی شب نالۂ دل یوں صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

کہاں تک ستم حسن والوں کے سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
اودھ کے پھولوں سے دل ہے بسا ہوا تاقب — جہاں رہوں میں وہیں بوئے لکھنؤ آئے
بیتابیِ دل دیکھ کے تڑپا ہے جگر بھی — ہاں اے قدر انداز کوئی تیر ادھر بھی
گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دیے — تھا آشیاں مگر تیرے پھولوں سے دور تھا
انفعال و داد خواہی کا سماں دیکھا کیے — وہ زمین دیکھا کیے ہم آسماں دیکھا کیے
یہی سمجھ کے جفاؤں کا سلسلے چھوڑو — کہ جس کی موت نہ آئے وہ کس طرح مر جائے
ملا کے دستِ دعا ظرف اک بنایا ہے — لیے ہوں ہاتھ میں کاسہ خدا کرے بھر جائے
خموشی پر مری کیوں بدگمانی ہے مرے دل سے — وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے
خوف محشر کس لیے آنکھوں کو دھوکا ہو گیا — ایک ہی صورت کے ہوں گے مرے قاتل اور آپ

کاظم حسین محشر (متوفی ۱۹۳۳ء، بعمر تقریباً اسّی سال) عزیز کی طرح قصیدہ گو تھے لیکن غزلیات بھی کہی ہیں جو دیوان کی شکل میں شائع ہوئی تھیں لیکن اب یہ دیوان ناپید ہے۔ نمونتاً چند شعر پیش ہیں:

بس بس اے مست جوانی یہی ارمان تھا بس — کھنچ سکے دل پہ مرقع تری انگڑائی کا
تم کو بیمارِ محبت کی خبر ہے کہ نہیں — نام بدنام نہ ہو جائے مسیحائی کا
ان کے ادراک کی قوت پہ خدا اے محشر — مدعا بے کہے سمجھیں جو تمنائی کا
صورت ناز اور ہے خلوت راز اور ہے — ایسے جمال و حسن کا آئینہ ساز اور ہے
شکوۂ ہجرِ یار کون کرے — حسن کو شرمسار کون کرے
بیوفا، سنگ دل، جفا پیشہ — ایسے ظالم کو پیار کون کرے
ہم زباں ہو کے جسے سب نے کہا صبحِ ازل — اک فسانہ ہے تری انجمن آرائی کا
زمانے والے عالم سے جسے تعبیر کرتے ہیں — وہ کیا ہے، مختصر قصہ مرے خوابِ پریشاں کا
کشاکش ہائے باہم سے مٹی روحانیت محشر — خدا حافظ ہے شیخ و برہمن دونوں کے ایماں کا
دم لے اے موت نہیں تو یہی ہوگا مشہور — ناز اٹھایا نہ گیا ان کی مسیحائی کا

انور حسین آرزو (پیدائش ۱۸۷۲ء، وفات ۱۹۵۳ء) صحیح معنوں میں آخری استاد جنہیں

جملہ فنونِ شعر، بشمول قواعد و عروض، پر مکمل عبور حاصل تھا اور انشا، اللہ خاں انشاؔ کے بعد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خالص اردو ادب پیش کیا۔ ان کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ جو کہنا نہ تھا وہ کہہ جانا

اندازۂ سلامتِ عالم نہ پوچھیے
چاروں طرف کے تیر تھے اور اک نشانہ تھا

اس بے وفا سے قاصد اب کیا پیام کہنا
جاتا ہے تو تو اچھا، میرا سلام کہنا

دل ہجومِ ہوس سے نکلا خوب
اور بڑی آن بان سے نکلا

صیّاد کا برا ہو کہ جب تک رہی بہار
بے درد روز باغ میں لے کر قفس گیا

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی، بے مے پیے کیفیت یہ ہوئی
اک ہاتھ سے بوتل چھوٹ پڑی، اک ہاتھ سے پیمانہ چھوٹا

خموشی میری معنی خیز ہے اے آرزو کتنی
کہ جس نے جیسا چاہا ویسا افسانہ بنا ڈالا

راستی کو کیا وہ جانے جس کے دل میں ہو فریب
بات سیدھی سی بھی سن کر دیر تک سوچا کیا

وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا
تھیں آنکھیں بند زمانے کی، یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا

یہ میری، توبہ نتیجہ ہے بخلِ ساقی کا
ذرا سی پی کے کوئی منھ خراب کیا کرتا

بیٹھے بیٹھے اس کی باتیں یاد آنا خود بخود
دل ہی دل میں سوچنا پھر مسکرانا خود بخود

اداشناس نگاہوں نے ایسا کچھ دیکھا
جواب کی نہ تمنّا رہی سوال کے بعد

مدّتوں کے ضبطِ غم پر آج پانی پھر گیا
رو دیے ہم اور بھی آنسو نکل آنے کے بعد

ہے نگاہِ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو، اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

پھولوں کی مہک قہر ہے، سبزے کی لہک زہر
بڑھ جاتا ہے کچھ سیرِ چمن سے خفقان اور

کڑیاں نہ بڑھا قید کی او کوششِ ناتمام
تھکنے سے ہوئی جاتی ہے زنجیر گراں اور

دار القضا کے لوگ سخن ناشناس ہیں
حق کہہ کے بھی بچیں گے نہ دار و رسن سے ہم

زنداں بھی وسیع ہے زنجیر بھی دراز
آزادیِ خیال کے چکّر میں قید ہوں

میں روکشِ دو رنگیِ لیل و نہار ہوں
آتی ہوئی خزاں ہوں نہ جاتی بہار ہوں

جنگ جوئی مایۂ صبر و رضا ہوتی نہیں
ہر زمیں بننے سے مقتل کربلا ہوتی ہے

اک چپ کے معنی سیکڑوں اک غم پہ لاکھوں تہمتیں
اتنا ہی رسوا ہے جہاں جتنا حیا پرور ہوں میں

مشقِ جفا سے پوچھ لے، ترکِ ستم سے پوچھ لے | پتھر سے بڑھ کر سخت ہوں شیشے سے نازک تر ہوں میں
دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زبان کیلی ہے | سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہے
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے | ہم ہیں کہ ٹلے ہیں مٹنے پر، وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
جی ہیں ادھر گھٹی ہوئی، ادھر سوئے ہو کے کیا جییں | اور ادھر یہ بانکپن، مرتے پہ ہاتھ کیا اٹھائیں

ذاکر لکھنوی خاندانی شاعر اور اُستاد تھے جن کے بیٹے فضل نقوی صاحب خود مرتبۂ استادی پر فائز تھے اور موجودہ دور کے کچھ مشہور شعرا مثلاً کرشن بہاری نور، شمبھو دیال شفق مرحوم ان کے تربیت یافتہ ہیں۔ ذاکر صاحب کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں :

اب تک ہے کہاں تو کہ دو عالم سمٹ آئے | وقت آ گیا محشر میں تری جلوہ گری کا
ہے یاد ابھی تک مجھے رفتارِ جوانی | وہ جھوم کے چلنا وہ قدم بے خبری کا

ملّا صاحب کے خالص لکھنوی سینیر معاصرین کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر منشی نوبت رائے نظر اور ظریف لکھنوی کا ذکر نہ کیا جائے۔ نظر (متوفی ۱۹۲۳ء) ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ مزاح نگار بھی تھے اور ظریف لکھنوی (پیدائش ۱۸۷۰ء، وفات دسمبر ۱۹۳۷ء) کو تو اکبر الٰہ آبادی کے بعد اردو زبان کا سب سے بڑا مزاح نگار سمجھنا چاہیے جس نے اکبر ہی کی طرح طنز و مزاح سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لیا۔ نظر کے کچھ سنجیدہ اشعار بطورِ نمونۂ کلام پیش ہیں :

اس سے بڑھ کر اور کیا ہے سادہ لوحی عشق کی | آپ نے وعدہ کیا اور مجھ کو باور آ گیا
نہ چھیڑ اے ہمنشیں ناکامیِ حسرت کا افسانہ | کہ اب تو بات کرنے سے بھی دل میں درد ہوتا ہے
ابھی اور طول دیتے غمِ عشق کو نظر ہم | اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا
چھوڑا ہر اک نے ساتھ دمِ جستجوئے دوست | ایک ایک نقشِ جادۂ منزل میں رہ گیا
زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات | اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

ظریف لکھنوی کا کلیات "دیوانجی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ تبرکاً چند شعر پیش ہیں :

ہوائے شوق اگر مجھ کو یوں ہی مجبور کرتی ہے | وہاں چل کر کروں گا گشت جو بے خارِ گلشن ہو
پنہاؤں فکر کو اس حسن سے جامہ ظرافت کا | کشادہ ہر طرف تہذیب کا جس میں کہ دامن ہو

داغ کے درہم و دینار بھرے ہیں جس میں
دل وہ کیونکر ہوا صرّاف کی تھیلی نہ ہوا

خیالی ہجر میں فرضی مریضِ غم کا مر جانا
یہ سب کیا ہے؟ سلامت جھوٹ کے پُل سے اُتر جانا

دولتی سے سمندِ ناز کی عاشق کا مر جانا
یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا

کوشش ہوا اٹھانے کی تو کیونکر نہ اٹھے گا
لُنجے نہیں ہیں آپ جو خنجر نہ اٹھے گا

کہنے کو کیسے مان لوں جھوٹ میں سچ ملا ہوا
تیغ بند ہے تو کس طرح یار کے جیب کمر نہیں

سندیں دے کے بناتے ہیں مجھے سب شاعر
لکھنؤ والوں کی سنجیدہ ظرافت دیکھی

عہدِ ملا کا ابتدائی دور لکھنؤ میں ادبی معرکہ آرائیوں کا دور تھا۔ صفی، عزیز، ثاقب، آرزو لکھنوی اور خالص لکھنوی تھے لیکن اسی زمانے میں کچھ باہر سے آنے والے شعرا نے بھی لکھنویت کا دعویٰ کیا اور اس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ لکھنؤ اسکول کی بنیاد ہی باہر سے لکھنؤ آنے والوں نے رکھی۔ اس گروہ کے سربراہ یگانہ چنگیزی تھے جو اصل اہلِ لکھنؤ کی مخالفت میں دائرۂ تہذیب سے بھی باہر نکل گئے تھے اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے مسلسل حضرت صفی کو حضرت خفی اور جناب عزیز میاں کو ذلیل لکھا ہے بلکہ اگر عرشی لکھنوی کے قول پر اعتماد کیا جائے کیننگ کالج کے مشاعرے میں وہ عزیز صاحب سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :-

محرومیوں میں گذری ناکامیوں میں گذری
عمرِ عزیز گذری اور خامیوں میں گذری

ان باہر سے آ کر لکھنؤ میں بس جانے والوں میں محمد احمد بیخود موہانی، عبدالباری آسی الدنی کے نام سرِ فہرست ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ ان سب کو مرتبۂ استادی حاصل تھا اور انھیں مکتبۂ لکھنؤ کے اہم ارکین میں شمار کیا جانا چاہیے اس لیے کہ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ اپنی پوری زندگی لکھنؤ میں گذاری اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے، بلکہ ان کا رنگِ سخن بھی انھیں خصوصیات کا حامل ہے جو ان کے عہد میں رائج ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا تھا اور جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مثال کے طور پر ان حضرات کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ لطفِ زبان، بلندیِ تخیل، داخلی کیفیتوں کے اظہار رمزیہ و استعاراتی پیرایۂ بیان اور سنجیدگی مضامین ان کا مرتبہ بھی کم از کم اتنا ہی بلند ہے جتنا صفی صاحب اور عزیز صاحب کا۔

بیخود موہانی (پیدائش ۱۸۸۳ء، وفات: ۱۹۴۰ء) اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر

بیخودؔ صاحب کو قدرتِ کامل حاصل تھی اور شیعہ کالج میں وہ ان دونوں زبانوں کے استاد تھے۔ کلیاتِ بیخودؔ جس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار ہیں، شائع ہو چکا ہے اور ڈاکٹر سکندر آغا کو بیخودؔ پر تحقیقات کرنے پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے مل چکی ہے۔

یہ دل کے داغ ہیں ملتے ہیں جس کو ملتے ہیں
سپاسِ نعمتِ پروردگار کرتا جا

ابھی چمن ہے قفس تو ابھی قفس ہے چمن
نظارۂ چمنِ روزگار کرتا جا

شعلے وہی، بگولے وہی، آندھیاں وہی
کیا مر کے قیس جانِ بیاباں نہیں رہا

بے پردہ ایک دم رخِ جاناں نہیں رہا
پردہ اٹھا تو ہوش میں انساں نہیں رہا

غم و حرماں کی تاریکی زمیں سے آسماں تک ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے مری دنیا جہاں تک ہے

امنگ کا یہ رنگ ہے ہجومِ رنج و یاس میں
کہ جس طرح کوئی حسیں ہو ماتمی لباس میں

چمن کا لوٹا لوٹا بجلیوں نے خاک کر ڈالا
یہ طوفاں ہم تو سمجھے تھے ہمارے آشیاں تک ہے

کہاں کی برق، کس کا دل، نظر کر ذرّے ذرّے پر
کہ بیتابی ہی بیتابی ہے یہ دنیا جہاں تک ہے

کہتے ہیں تیری لاش پہ آیا نہ جائے گا
تو ان سے خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

نشیمن پھونکنے والے ہمارے زندگی کیا ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

اک نام زندگی بھی ہے قیدِ حیات کا
تا مرگ آب و گل کا یہ زنداں ہے اور ہم

نشیمن پھونک کر فارغ رہا ہے باغباں برسوں
نگاہوں میں مری جلتا رہا ہے آشیاں برسوں

اے باغبانِ گلشنِ ہستی بتا مجھے
اپنی بہار ہوں کہ چمن کی بہار ہوں

مٹنا نہیں قبول تو دنیا میں آئے کیوں
دھاکے پہ آندھیوں کے نشیمن بنائے کیوں

یہ عمر اپنی تنکے ہی چنتے گزر گئی
ہم ایسے بدنصیب کہاں آشیاں کہاں

میں سمجھتا ہوں جب دل کو تو کہتا ہے متانت سے
زمانے کی زباں تم ہو حقیقت کی زباں میں ہوں

بیخودؔ طلسمِ ہستیِ موہوم پر نہ جا
یاں کیا دھرا ہے پردۂ گرد و غبار میں

کیسے مجرم ہیں ہم کہ قاتل بھی
ذبح کرتے ہیں روتے جلتے ہیں

رات اندھیری ہے، دیکھیے کیا ہو
جاگنے والے سوتے جاتے ہیں

پروانہ سوزِ شمع سے یوں بے خبر نہ ہو — دل سے لگی نہ ہو تو زباں میں اثر نہ ہو
کاہے کو یوں بسی کبھی بستی خیال کی — دنیا اجڑ بھی جائے تو ہم کو خبر نہ ہو
یا اٹھتی موج چلتی ہوا سے تھی برہمی — یا اب مجھے ملال کسی بات پر نہ ہو
یوں کہہ رہا ہے کوئی دلِ مبتلا کا حال — ہر اک سمجھ رہا ہے مری داستاں نہ ہو
تو نے ازل میں دل پہ یہ کیسی نگاہ کی — اب تک ہے زلزلے میں زمیں جلوہ گاہ کی
تمام بزم سیہ پوش ہونے والی ہے — ہوا نے ٹھان لی جلتے کنول بجھانے کی
مجھے دوزخ ہے یہ مجھ کو نکل جانے دے جنت سے — خداوندا گناہوں کی پشیمانی نہیں جاتی
کسی کافر کو یہ دعویٰ کہ کعبہ ڈھا دیا میں نے — خوشی مجھ کو کہ دل، یعنی طلسمِ آرزو ٹوٹا
کافر و دیندار کی دنیا میں راہیں اور تھیں — موت کی منزل میں دونوں کو بہم جانا پڑا
جنت کہاں بہارِ دیارِ بتاں کہاں — توبہ کرو، زمیں کہاں آسماں کہاں
محشر بھی ایک منزلِ راہِ وجود ہے — بتلاؤں کیا، رکے گا مرا کارواں کہاں

مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی (پیدائش ۱۸۸۴ء، وفات ۴ فروری ۱۹۵۶ء) عظیم آباد میں پیدا ہوئے لیکن لکھنؤ کو وطنِ ثانی بنایا اور یہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ اپنی ضرورت سے زیادہ تیکھی طبیعت کی وجہ سے ناکام زندگی بسر کی۔ فطری و شاعرانہ خصوصیات کی مناسبت سے انھیں اردو زبان کا عرفی کہا جا سکتا ہے اور عرفی ہی کی طرح ابو الفضل کے الفاظ میں "گلِ استعدادش نشگفتہ پژمرد"۔ اپنی فطرت کی اسی خامی کی وجہ سے آخری بیس سال کا کلام کھو بیٹھے جس میں نہ جانے کیا کیا جواہر پارے ہوں گے۔ آیاتِ وجدانی کے عنوان سے اردو اور فارسی کلام شائع ہو چکا ہے۔ چند اشعار نمونتاً پیش ہیں:

کششِ لکھنؤ ارے توبہ — پھر وہی ہم وہی امین آباد
جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاسِ اہلِ دل — آبروئے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں
کجا طرزِ یگانہ اور کجا اندازِ بیگانہ — بجا ہے لکھنؤ کو رشک ایسے صاحبِ فن پر
بہارِ لکھنؤ کو خونِ دل سے کس نے سینچا ہے — خدا لگتی بھی کہہ دے گا کوئی پتّا زباں ہو کر
منم کہ لکھنؤ را جانِ تازہ ای دادم — منم خدا سخن یاس و ناخدائے خودم

جو پہلے درد تھا اب داغ بن کر دل میں روشن ہے
بس اتنا فرق پاتا ہوں ضعیفی اور جوانی میں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

یکساں کبھی کسی کی بھی گذری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

مزہ گناہ کا جب تھا کہ با وضو کرتے
بتوں کو سجدہ کبھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

سجدہ صبح و شام کیا کرنا
غائبانہ سلام کیا کرنا

جنھیں ذوقِ حضوری خواب بیداری میں حاصل تھا
خداوندا وہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم، گھر کا راستہ نہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
بھٹک کر راہ سے پھر راہ پر آنا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ
مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

ہر گلی و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد
الحذر دلِ حیراں، صد بہار و من تنہا

نکتہ داں خود سازم میرزا یگانہ را
دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہوگی یاسؔ
پھر کیا بڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

بدگمانوں کی مہربانی سے
پاک دامن بچے نہ دامن چاک

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھٹک لے، بھیک نہ مانگ

پار اُترے کیا دو آبۂ امید و بیم سے
جب تک یگانہ دل کو یقینِ خدا نہ ہو

شر ہوں میں، فرشتہ کیوں بنوں، جیسا ہوں اچھا ہوں
بغاوت اپنی فطرت سے نصیبِ دشمناں کیوں ہو

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہو
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے

نہ انتقام کی عادت نہ دل دکھانے کی
بدی بھی کرنی نہیں آتی مجھے، کجا نیکی

شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ
انساں کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

خدا کے سامنے دامن پسارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے

یگانہ لکھنؤ کی سیر کر آتے تو اچھا تھا
طبیعت سان پر چڑھنے کے قابل ہوتی جاتی ہے

کشتیِ حیات اپنی جا رہی ہے دھارے پر
سنگ دل تماشائی ہنستے ہیں کنارے پر

دل وہی شکستہ دل پھر بروئے کار آیا

عبدالباری آسی الدنی بیخودؔ و عزیزؔ و یگانہؔ کے معاصر تھے اور استادانہ قدرتِ کلام رکھتے تھے۔ چند اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

دیکھیے کس کی خطا ہے کس کے سر الزام ہے
موت غفلت کر رہی ہے زندگی بدنام ہے

رنج و راحت کا نہیں بزم جہاں میں امتیاز
سازِ عشرت بھی اک آوازِ شکست جام ہے

پھولوں میں رنگ و بو ہے تاروں میں کہکشاں ہے
سچ سچ بتا کہ تیرا جلوہ کہاں کہاں ہے

ایک ہیں ہستی و عدم دونوں
ابتدا کیا ہے، انتہا کیا ہے

زیست کیا چیز ہے فنا کیا ہے
آخر اس سب کا مدعا کیا ہے

حالت نہ پوچھیے دلِ شوریدہ حال کی
قطرہ ہے اپنے ساتھ سمندر لیے ہوئے

اندھی تھی آرزو کہ نہ مانی کسی طرح
میں نے بہت کہا کہ جہاں میں نہ گھر بنا

میں نے تو چند اشکِ ندامت کیے ہیں پیش
یہ تیرا کام ہے کہ تو ان کو گہر بنا

حسن گل میں نہ سہی، نغمے کی آواز میں آ
ایک انداز نہیں دوسرے انداز میں آ

طاقتِ رفتہ کہاں پھرتی ہے آوارہ وطن
آ پھر اک بار، مرے شہپرِ پرواز میں آ

ہر رگِ گل میں ہیں سو دامِ فریب اے بلبل
مشورہ کس نے دیا تجھ کو کہ پرواز میں آ

وقتِ آخر ہیں تو اے موت سبھی آتے ہیں
قصد آنے کا ہے تو عشق کے آغاز میں آ

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

اب کے جب آئیں گے گھر میں لے دلِ دیوانہ ہم
ساتھ لیتے آئیں گے جنگل سے اک ویرانہ ہم

آزردہ سے، افسردہ سے، حیران سے رہے ہم
تم مل بھی گئے پھر بھی پریشان سے رہے ہم

ایمان تو کجا بُت کدۂ عشق میں آسی — اتنا بھی بہت ہے کہ مسلمان سے رہے ہم
نظر نیچی، عرق آیا ہوا سا — ملا بھی وہ تو شرمایا ہوا سا
مرا افسانہ سن کر کیا کرو گے — کچھ الجھا ہوا سا کچھ الجھایا ہوا سا
کہیں سے ڈھونڈھ کے لا دیے ہیں کبھی اے گلِ تر — وہ زندگی جو گذر جائے مسکراتے میں
دیکھتا ہے نہ عمارت کو نہ ویرانے کو — جس جگہ پڑ رہا، نیند آگئی دیوانے کو
نہ ہم سفر ہے نہ رستا دکھا رہا ہے کوئی — میں جا رہا ہوں کہیں اور بلا رہا ہے کوئی
نظر میں، دل میں، تخیل میں جگمگائے جا — چراغِ خانۂ آشفتگی جلائے جا

یہ تھے چند نمونے اس لکھنوی غزل کے جس کی ابتدا گذشتہ صدی کے آخر میں ہوئی اور ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں بھی شاعری پر عموماً اور غزل پر خصوصاً لکھنوی شعرا کی گرفت اور فوقیت برقرار رہی اور اگر یہ کہا جائے کہ معاصرین اور آئندہ کے لکھنؤ کے باہر کے بزرگ شعرا خصوصاً غزل گویوں نے جو رنگِ سخن اختیار کیا وہ اسی سبک کا چربہ تھا جس کی لکھنؤ میں تخلیق ہوئی تھی متذکرہ اشعار جنھیں مشتے از خروارے سمجھنا چاہیے۔ پوری طرح اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس دور میں وہ قدامت پسندی اور روایت پرستی جو انحطاط پذیر معاشرے کی دین تھے اور جس کی خصوصیات تکلّف، تصنّع، خارجیت، فرضی ہوس آمیز جذبات کی ترجمان، بے کیفی، حقائق سے گریز اور فرسودہ خیالی ہیں، کے اثرات لکھنوی شاعری سے پورے طور سے ختم ہو کر ایک صحت مند سبک وجود میں آگیا تھا جس میں فرسودگی خیال کی جگہ علوئے تخیل نے، آورد کی جگہ آمد نے، ہوس آمیز تلذذ کی عشق کے پاکیزہ جذبات نے، خارجیت کی جگہ داخلی کیفیتوں کے اظہار نے، مبالغہ کی جگہ حقیقت پسندی نے لے لی تھی۔ یہی دور تھا جب اظہار و بیان کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کر لیا گیا تھا اور زبان کی شستگی اور صفائی جس کی ابتدا ناسخ کے عہد سے ہوئی اس عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی گئی اور اردو وہ اردو بن گئی جس کے بولنے والے کو ہندوستان کے کسی حصے میں بھی محض اس کی زبان سن کر پتا لگا لیا جاتا تھا کہ وہ لکھنؤ کا باشندہ ہے اور راقم الحروف کو خود اس کا تجربہ کلکتہ میں ہوا جب ایک معمولی قصاب نے محض لہجہ کی بنا پر مجھ سے سوال کیا

کہ کیا میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ جادۂ ملّا کے دیباچے میں خلیق انجم صاحب نے نشان دہی کی ہے کہ ملّا صاحب سے پہلے چکبست ایسے شاعر تھے جن کی شاعری میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکّاسی ملتی ہے۔ میں اس قول میں یہ اضافہ کرنے کی جسارت کروں گا کہ نظم گوئی کا یہ رجحان جس کی طرف خلیق انجم صاحب نے اشارہ کیا ہے، چکبست کے علاوہ ان کے دوسرے لکھنوی معاصرین میں بھی ملتا ہے چناں چہ اس وقت بھی صفیؔ کے کلام میں نظموں کے اشعار کی تعداد غزلوں کے اشعار کی تعداد سے زیادہ ہے اور لختِ جگر میں شامل چوبیس نظموں کے علاوہ جو شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھی گئیں ان کی دوسری نظمیں آغوشِ مادر، محبّت، چراغِ دیر، عقدِ پروین، بسنت مالتی، ہفت خواں اردو، آہنگ حجازی، وغیرہ بھی موجود ہیں جو مختلف اصنافِ سخن میں کہی گئیں۔ یہی کچھ حال عزیزؔ لکھنوی کی شاعری کا بھی ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت خوب صورت نظمیں ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ دائرۂ ادب (جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) کی نشستوں کے لیے بھی مختلف شعرا نے متعدّد نظمیں کہیں۔

گذشتہ صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ اصلاحِ زبان اور مروّجہ شعری ذوق کو سدھارنے میں صفیؔ کا بڑا حصّہ ہے اور اسی کام کے لیے انھوں نے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۰ء میں دائرۂ ادبیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت مشاعرہ، مناظمہ، مناثرہ کی ماہانہ نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ مشاعروں میں مصرعِ طرح کے بجائے قافیہ، ردیف اور بحر کا نام دے دیا جاتا تھا اور نظم و نثر کی نشستوں کے لیے مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس اصلاحی تحریک میں دوسرے لوگ مثلاً آغا بابر، نوبت رائے نظر، منے مرزا شررؔ، مرزا ہادی عزیزؔ، کاظم حسین محشرؔ، حکیم ناطقؔ، مرزا رسواؔ، منشی سجّاد حسین وغیرہ بھی شامل ہو گئے اور اس کی نشستوں میں مرزا ثاقبؔ، فریدون مرزا مجروحؔ، ننھو صاحب شفیقؔ، ڈاکٹر متین قزلباش وغیرہ بھی شریک ہونے لگے اور اس نے لکھنؤ کی پہلی ادبی انجمن، انجمنِ معیار الادب کی شکل اختیار کر لی جس کا نقیب رسالہ "معیار" تھا جس کی ادارت کی ذمّہ داری عزیزؔ لکھنوی کو سونپی گئی۔ یہ دور ملّا صاحب کے بچپن کا دور تھا اور لکھنؤ کی کیفیت یہ تھی کہ یہاں کا بچّہ بچّہ شعر کہہ رہا تھا۔ متذکرہ بالا اساتذہ کے علاوہ بیسوں دوسرے شعرا اور اہلِ قلم اس ادبی انجمن کے جلسوں اور مشاعروں میں دیکھے

جاتے تھے جن میں ذاکر لکھنوی، راز لکھنوی، عالم لکھنوی کو استادانہ وقار حاصل تھا اور آخر الذکر فنِ تاریخ گوئی میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے۔ انجمن کی شعری نشستوں میں آداب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر شاعر اپنے مرتبے کے مطابق نشست میں اپنا مقام خود متعین کر لیتا تھا۔ مصرعوں کو اٹھانا تہذیبِ مشاعرہ میں داخل تھا اور بسا اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر کسی نومشق سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو مصرعہ اٹھانے ہی کے دوران کوئی نہ کوئی استاد شعر یا مصرعے کو درست کر دیا کرتا تھا۔

انجمن معیار الادب جلد ہی نا اتفاقیوں کے نذر ہو گئی جس کا خاص سبب عزیز لکھنوی کا صفی لکھنوی سے منحرف ہو جانا تھا۔ معیار الادب کے خاتمے سے بھی لکھنؤ کی ادبی فضا پر کوئی اثر نہ پڑا۔ معیار الادب میں اصلاحِ زبان و بیان کی طرف جو قدم اٹھایا گیا تھا وہ بار آور ہو چکا تھا۔ معیار الادب کے خاتمے کے بعد ایک دوسری اہم انجمن معین الادب ظہور میں آئی جس میں انجمن معیار الادب کے سینیر ممبروں کے علاوہ انھیں اساتذہ کے ابھرتے ہوئے شاگردوں نے بھی اہم حصّہ لینا شروع کیا۔ سر تیج بہادر سپرو اس نئی انجمن کے سرپرست تھے، مولانا صفی صدر اور بہار لکھنوی سکریٹری اور اس کے نوجوان ممبروں میں حکیم آشفتہ، آل رضا ایڈوکیٹ، قدیر لکھنوی، سراج لکھنوی، منظر لکھنوی، تپش لکھنوی، بدر الحسن بدر فعّال ہستیاں تھیں۔ آخر میں ان حضرات سے نوجوان تر حضرات مثلاً عمر انصاری، سالک لکھنوی، آرم لکھنوی وغیرہ بھی معین الادب کی نشستوں میں شرکت کرنے لگے اور انجمن کے باقاعدہ ممبر بنا لیے گئے۔ یہ مشاعرے تمام تر طرحی مشاعرے ہوتے تھے جن میں لکھنؤ کے شاعروں کے علاوہ باہر کے اساتذہ بھی شرکت کرتے تھے۔ ایسی نشستوں میں عموماً سات یا نو قافیے متعین کر دیے جاتے تھے۔ جن میں غزلیں کہی جاتی تھیں۔ مطلع کے لیے علاحدہ قافیہ مخصوص ہوتا تھا۔ معیار الادب کے بر خلاف معین الادب کی طرف سے مشاعروں کے گلدستے شائع نہ ہو سکے۔ معین الادب کے نئے شرکا یعنی حکیم آشفتہ، منظر، قدیر، سراج، شمس وغیرہ نے جلد ہی معراج الادب کے اندر اپنا ایک گروہ قائم کر لیا جو "ینگ پارٹی" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ حضرات مشاعروں میں ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے اور مشاعروں پر چھا جانے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ ہی زمانے کے بعد یہ "ینگ پارٹی" کسی شکایت کی بنا پر معین الادب سے علاحدہ

ہوگئی اور انھوں نے انجمنِ معراج الادب قائم کر لی لیکن علاحدہ ہونے کے بعد بھی دونوں گروپوں میں تعلقات خوشگوار رہے۔ بہارؔ صاحب کے بعد معین الادب اور معراج الادب کو پھر متحد کرنے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں ایک نئی انجمن "بہارِ ادب" وجود میں آئی لیکن معین الادب کے بعض ممبروں مثلاً عزیزؔ لکھنوی، آفتاب لکھنوی، ذاکر لکھنوی، حکیم محسن صاحب ادیبؔ وغیرہ کو یہ سمجھوتہ پسند نہ آیا اور انھوں نے انجمن معین الادب کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور انجمن کو فعّال رکھنے کے لیے سیّد نواب افسرؔ اور عمرؔ انصاری کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا اور ایک رسالہ "معیار" جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی ذمّہ داری سیّد نواب افسرؔ، عمرؔ انصاری اور فضل نقوی کے سپرد ہوئی۔ بہر حال کچھ عرصے کے بعد اس باقی ماندہ معین الادب کے ممبران بھی بہارِ ادب میں شریک ہوگئے جس کے بعد پنڈت آنند نرائن ملاؔ کو اس کا جنرل سکریٹری بنایا گیا اور عمرؔ انصاری اور قدیرؔ لکھنوی اس کے سکریٹری ہوئے اور صفیؔ صاحب بدستور صدرِ انجمن رہے اور جہاں تک ذہن کام کرتا ہے سیّد نواب افسرؔ صاحب انجمن کے جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔ انجمن بہارِ ادب کی تشکیل کے وقت ملاؔ صاحب شعرائے لکھنؤ میں اپنا مقام بنا چکے تھے اور بہارِ ادب کے فعّال ترین ممبروں میں تھے اور انجمن کے ایک سال وہ سکریٹری ہوئے تھے اور دوسرے سال سیّد آلِ رضا صاحب رضاؔ، اور جب بھی سکریٹری بدلتا تھا انجمن کی کوئی نہ کوئی تقریب منعقد ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی زمانے کی یادگار وہ مشاعرے ہیں جن میں سے ایک محفلِ شعر و نغمہ کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا دریائی مشاعرہ۔ محفلِ شعر و نغمہ کا انعقاد قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں آل رضا صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران ہوا اور ہندوستان بھر کے مشہور شعرا اور اساتذہ کو دعوتِ سخن دی گئی۔ ایک رات بارہ دری میں عظیم الشان مشاعرہ ہوا جو ادبی حیثیت سے اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور دوسری رات محفلِ نغمہ منعقد ہوئی جس میں پہلی رات کے معرکۃ الآرا غزلوں کو معروف گانے والیوں نے نغمے کی شکل میں پیش کیا۔ دریائی مشاعرہ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں ملاؔ صاحب کی سکریٹری شپ کے دوران منعقد ہوا۔ گرمی کا موسم تھا۔ گومتی کی پانی کی سطح پر پُل بنانے والے پیپوں پر مشاعرے کا پنڈال بنایا گیا

اور مشاعرہ گاہ کو موٹے رسّوں سے کنارے پر میخوں سے باندھا گیا۔ موسم کی رعایت سے اہلِ محفل کی ضیافت بالائی کی برف کے آبخوروں سے کی گئی تھی۔ مشاعرہ گاہ کے بھرتے ہی رستے کھول دیے گئے اور مشاعرے کا پنڈال گومتی کی سطح پر نظر آنے لگا۔ لکھنؤ کے شعرا میں آل رضا، حکیم آشفتہ، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، منظر لکھنوی، عمر انصاری، احسن طباطبائی مئے آغا ذکی، ارم لکھنوی، تپش لکھنوی، ہزار لکھنوی، بدر لکھنوی، عرشی لکھنوی وغیرہ نے اپنی کامیاب غزلوں سے مشاعرے کو ایک عظیم الشان ادبی اجتماع بنادیا تھا۔ اس مشاعرے کا طرحی مصرعہ تھا ؎

دریا کی روانی ہے، بہتا ہوا پانی ہے

بہارِ ادب کے مشاعرے لکھنؤ کے اہم شعرا اور روسا کے مکانوں پر منعقد ہوا کرتے تھے اور صرف اہلِ ادب تک محدود رہتے تھے لیکن متذکرہ دونوں مشاعروں نے خواص کے علاوہ عوام کو بھی ان میں شرکت کا موقع دیا تھا اور اس لحاظ سے ہندوستان بھی میں عوامی مشاعروں کی ابتدا قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہارِ ادب کے بعد فردوس ادب نے لکھنوی شعری روایت کو برقرار رکھا اور اس انجمن کے وہ اشعار یقیناً یادگار ہیں جو یومِ ناسخ، یومِ آتش، یومِ خواجہ وزیر، یومِ چکبست اور یومِ آسی کے نام سے موسوم مشاعروں میں پڑھے گئے لیکن بہارِ ادب کا اصل کارنامے وہ نعتیہ مشاعرے ہیں جو گیارہویں اور بارہویں ربیع الاول کی درمیانی شب کو امین آباد پارک میں منعقد ہوا کرتے تھے اور جن کے تتبع میں ہندوستان بھر میں نعتیہ مشاعروں کا رواج ہوا۔ خصوصی ادبی نشستوں کو عوامی مشاعرہ بنانے میں فردوسِ ادب کے ان نعتیہ مشاعروں کو بھی بڑا دخل ہے۔

تقسیمِ ہند سے پہلے لکھنؤ کے گلی کوچے شعر و نغمے سے گونج رہے تھے۔ خواہ ہندو، خواہ مسلمان، ہر ایک کی زبان اردو تھی اور متذکرہ معروف انجمنوں کے علاوہ ہر پڑھے لکھے انسان کا مکان (خواہ وہ مولانا سبط حسن صاحب یا مفتی عنایت اللہ صاحب کے ایسے عالمانِ دین ہی کا کیوں نہ ہوں) ہر گلی اور سڑک کا چائے خانہ اور ہر اسکول اور کالج ادبی مرکز بن چکا تھا۔ چناں چہ اس عہد کے امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج، گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج

شیعہ انٹر کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ایسے ایسے مشاعرے ہوگئے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ یہ مشاعرے آج کل کے عوامی مشاعروں کی طرح Cultural get together- نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ خالص ادبی محفلیں ہوتی تھیں جن میں شعرا مخصوص مصرع ہائے طرح میں کلام پیش کرتے تھے۔ چناں چہ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں جوبلی کالج میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں محشر لکھنوی کے اس طرحی مطلع نے محفل لوٹ لی: ع

مے زیست ساقی نے دی اور سوا دی

مگر اک ذرا تلخیِ غم ملادی۔ اسی طرح ۱۹۴۰ء میں شیعہ کالج میں منعقد ہونے والا طرحی مشاعرہ جہاں تک یاد پڑتا ہے (جس میں ساغر نظامی، سیماب اکبر آبادی نے بھی شرکت کی تھی) میں بیخود موہانی کی درج ذیل مطلع سے شروع ہونے والی غزل حاصلِ مشاعرہ قرار پائی، ع

ارم میں بھی مگر گل کی پریشانی نہیں جاتی

کہیں اہلِ جنوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

اسی طرح اسلامیہ کالج کے مشاعرے اپنی ہمہ گیری کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور تھے جن میں شرکت کو ہر بڑا شاعر اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا اور اس وقت کے ہندوستان گیر شہرت کے تمام شاعر بشمول سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی، روش صدیقی، احسان دانش شریک ہوا کرتے تھے۔ مخصوص نشستوں میں وکٹوریہ اسٹریٹ (موجودہ تلسی داس مارگ) پر حکیم آشفتہ صاحب کا مطب، چوک میں خواجہ عبدالرؤف عشرت صاحب کی کتابوں کی دکان اور بعد کو امین آباد میں عمر انصاری کا مکان ادبی مراکز بنے ہوئے تھے۔ آشفتہ صاحب کے دوا خانے کیمیائے اودھ کے سامنے فٹ پاتھ پر پانی چھڑک کر کرسیاں ڈال دی جاتی تھیں اور وہاں اس عہد کے تمام سربرآوردہ شاعر مثلاً سراج لکھنوی، شمس لکھنوی، قدیر لکھنوی، آل رضا رضا، آرم لکھنوی اور ملّا صاحب اکثر و بیشتر نظر آتے تھے۔ منظر لکھنوی آشفتہ صاحب کے اس دوا خانے کا حساب کتاب دیکھتے تھے اور روز ہی ان محفلوں میں شریک رہتے تھے۔ ان نشستوں میں مشاعروں پر تبصروں کے علاوہ علمی اور شعری مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ حکیم صاحب کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد وہ علاقہ ایسے نشستوں سے کچھ عرصے محروم رہا لیکن

بعد کو کاظم حسین صاحب نے ایک چائے خانہ کھول دیا جو دواخانہ کیمیا نے اودھ کے تقریباً سامنے تھا اور اب اس قسم کی نشستیں اس چائے خانے کے سامنے فٹ پاتھ پر منعقد ہونے لگیں جہاں سراج، منظر، نہال، سالک اور ان کے شاگردوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ خواجہ عشرت کی کتابوں کی دکان زبان کی نزاکتوں پر بحث کا مرکز تھی۔ ابھی وہ زمانہ باقی تھا جب چوک کی طوائفیں تہذیب کی پتلیاں سمجھی جاتی تھیں جہاں آدابِ محفل سیکھنے کے لیے روسا اپنے بچوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ان طوائفوں کا ادبی مذاق بے حد ستھرا ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ ایک واقعہ ہے کہ عشرت صاحب کی دکان پر ادیبوں میں کسی لفظ کی تذکیر و تانیث پر بحث ہو رہی تھی۔ فیصلہ یہ ٹھہرا کہ چودھرائن، جن کا کوٹھا عشرت صاحب کی دکان کے سامنے تھا، ان کی رائے معلوم کی جائے۔ مسئلہ چودھرائن کے سامنے پیش ہوا جنھوں نے کسی معتبر استاد کا ایک شعر سند میں پیش کر دیا اور فیصلہ ہو گیا۔

لکھنؤ میں ذکا ہی ادب بھی سنجیدہ ادب کے دوش بدوش ترقی کر رہا تھا۔ ظریف لکھنوی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ظریفانہ شاعری کے علاوہ انھوں نے "تفریح الاحباب کلب" بھی کھولا تھا جس میں علمی مباحثے ہوتے تھے۔ ظریف کے جونیر معاصرین میں ماچس لکھنوی اور منوّر آغا مجنوں بلند پایہ ہازل تھے۔ چناں چہ ماچس کا مندرجہ ذیل شعر کا ذکر مولا عبدالماجد صاحب کے اخبار صدق تک میں آگیا: ؎

شیخ آئے جو محفل میں تو اعمال ندارد جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اسی ہزل کا دوسرا ایک شعر یہ ہے ؎

ماں باپ بہن بھائی سب آئے ہیں مرے گھر اب گھر مری سسرال ہے سسرالی ندارد

منوّر آغا مجنوں کے اشعار بھی بلند پایہ ہوا کرتے تھے مثلاً ؎

ڈرے وہ کیا بلائے ناگہاں سے جسے ہو سابقہ ننھے کی ماں سے
نہیں ڈرتا ہے مجنوں کوئی کہہ دے فلاں بنتِ فلاں بنتِ فلاں سے

ماچس صاحب نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں انجمن ظریف الادب قائم کی تھی جس کی باقاعدہ نشستیں ہوا کرتی تھیں چناں چہ ایسی ہی ایک نشست میں ناوک لکھنوی نے یہ شعر بھی پڑھا

تھا جس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں کس حد تک زبان پر توجہ دی جاتی تھی :

بیٹھے ہوئے ہیں لوگ کمندیں لیے ہوئے　　　پھسلی ذرا زبان کہ اہلِ زباں پھنسے

لکھنوی و کاہی ادب کا ذکر آفتاب لکھنوی اور ناظر حیاتی کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ان دونوں حضرات نے لکھنوی زبان اور لطیف ظرافت کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو مقہور ہوگئی۔ اسکولوں، کالجوں سے بیک جنبشِ قلم اسے ختم کر دیا گیا۔ اس وقت ان مجاہدین میں جنھوں نے اردو کے لیے زبان و قلم استعمال کیا، فراق گورکھپوری کے ساتھ آنند نرائن ملّا بھی شامل تھے۔ اس دور میں اردو کی جڑ پر کلہاڑی چل چکی تھی لیکن شاخیں ہنوز تر و تازہ تھیں۔ بہارِ ادب ختم ہو چکی تھی لیکن فردوسِ ادب زندہ تھی مگر اس کی محفلیں صرف نعت گوئی تک محدود تھیں۔ بہارِ ادب کے خلا کو ایک نئی انجمن بزم شعرا نے پُر کیا جس کی تشکیل میں حبیب احمد صاحب صدیقی آئی۔اے۔ایس، سید صدیق حسن صاحب آئی۔سی۔ایس، جعفر علی خاں اثر، سرورش طباطبائی وغیرہ نے اہم حصّہ لیا۔ ملّا صاحب کا بھی اس انجمن کو پورا تعاون حاصل تھا۔ انجمن میں کوئی عہدہ نہیں تھا صرف ایک کنوینر ہوا کرتا تھا جو مختلف صاحبِ ذوق حضرات کے مکانوں پر نشستوں کا اہتمام تھا۔ ابتدا میں امین سلونوی صاحب اس فرض کو انجام دیتے تھے لیکن بعد میں عمر انصاری کنوینر ہو گئے۔ بزم شعرا کی نشستیں بھی طرحی نشستیں ہوتی تھیں جن کے لیے عموماً دو مصرعے بطور طرح دیے جاتے تھے۔ مشاعرے دن کو دو بجے شروع ہوتے تھے اور وقت کی پابندی کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا اور محفل میں ابتدا سے لے کر آخر تک بیٹھنا بھی آداب میں شامل تھا۔ لکھنؤ کا بڑے سے بڑا آدمی خواہ وہ منسٹر ہو یا اعلیٰ افسر یا ڈاکٹر یا رئیس بزم شعرا کا اہتمام کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ بزم شعرا کی کچھ نشستیں وزیرِ اعلیٰ سمپورنانند کی قیام گاہ پر بھی منعقد ہوئی جس میں حافظ ابراہیم بھی شرکت فرماتے رہے۔ شرکائے بزم میں صرف انھیں شاعروں کو کلام پیش کرنے کی اجازت ہوتی تھی جنھیں اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ یہ نشستیں چلتی رہیں لیکن ان میں جو شاعر کم ہوتا گیا اس کی جگہ پُر نہ ہو سکی۔ صدیق صاحب کا انتقال ہو گیا، حبیب احمد صاحب پاکستان چلے گئے، سنہا صاحب کا لکھنؤ سے تبادلہ ہو گیا،

ملّا صاحب مستقلاً دہلی چلے گئے۔ اردو کی تعلیم ختم ہونے کے سبب ان حضرات نے جو جگہیں خالی کی تھیں وہ پُر نہ ہو سکیں لیکن پھر بھی غلام حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس، ذوالنورین صاحب آئی۔ اے۔ ایس، اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس، سبطین صاحب آئی۔ ایف۔ ایس، جسٹس مرتضیٰ حسین کے دروازے بزم شعرا کی نشستوں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ اس دور میں کنوینر تو عمر انصاری ہی رہے لیکن راقم الحروف اور ڈاکٹر کیسری کشور مرحوم ان نشستوں کے اہتمام میں پیش پیش رہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے سرکاری سطح کے خاتمے کے اثرات شعرا اور سامعین کی کمی کی شکل میں نظر آنے لگے اور لکھنؤ کی ہر انجمن کی طرح بزم شعرا کی نشستیں بھی پھیکی پڑنے لگیں۔ بہر حال اردو میں دلچسپی قائم رکھنے اور بزم شعرا کی نشستیں برقرار رکھنے کے لیے اصولوں میں نرمی برتنے کی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں طرحی نشستوں کے بجائے غیر طرحی نشستیں منعقد ہونا شروع ہوئیں جن میں کہنہ مشقوں کے علاوہ نو واردانِ ادب کو بھی شرکت کی اجازت دی جانے لگی۔ بزم شعرا کے ساتھ ساتھ ایک دوسری انجمن ادارۂ شعر و ادب بھی مغربی لکھنؤ میں فعّال تھی۔ ابتداءً اثر لکھنوی اس کی سرپرستی فرماتے تھے اور رہبر لکھنوی اس کے اصل کارکرتا تھے لیکن ان دونوں کے انتقال کے بعد پربھان شنکر سروش اناوی اس کے سرپرست بنے اور ان کے انتقال کے بعد "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کے مصداق اب مجھے اور پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کو اس کا سرپرست بنایا گیا ہے۔ حکیم شارب لکھنوی اس کے صدر ہیں اور ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت اس کے سکریٹری۔ اردو دانوں کی تعداد گھٹنے کی وجہ سے اس انجمن کا حال بھی بزم شعرا ہی کا ایسا ہے اور اس میں بھی طرحی نشستوں کی جگہ غیر طرحی نشستوں نے لے لی ہے۔

خدا ملّا صاحب کو اور طول زندگانی عطا فرمائے، ان کا عہد ایک طویل عہد ہے جس میں صفی لکھنوی سے لے کر آج کا نوجوان شاعر بھی ملّا صاحب کا معاصر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ملّا صاحب کے سینیر معاصرین کا ذکر کیا جا چکا۔ ان کے ہم عمر معاصرین میں وہی لوگ ہیں جو انجمن معین الادب میں "ینگ پارٹی" کے ممبر تھے۔ ان تمام حضرات نے بشمول ملّا صاحب اپنے بزرگ معاصرین کی اصلاحات اور رجحانات سے فائدہ اٹھایا اور ان کی

قائم کردہ غزل کی تندرست روایات کو برقرار رکھا۔ ان لوگوں کے کلام میں صفی کی متانت، عزیز کی علوِ فکر، یگانہ کا تیکھا پن، بیخود کا سوز و گداز اور حسین طرزِ ادا اور آزاد کی زبان کی شیرینی اور لطافت بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ داخلی کیفیات اور جذبات کی ترجمانی اور خالص غزل کی لطافت بھی ان شعرا کا طرۂ امتیاز ہے اور اس معنی میں وہ ہندوستان کے دوسرے مشہور غزل گویوں سے کسی طرح کم نہیں اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان سے بڑھ کر ہیں۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے خود ملّا صاحب نے اس صنف کو وقار بخشا اور خوبصورتی کے ساتھ بخشا لیکن لکھنؤ اسکول ہی سے متعلق عزیز لکھنوی کے شاگرد جوش ملیح آبادی (۱۸۹۰ء تا ۱۹۸۲ء) نے اتنی شاندار نظمیں کہیں کہ انھیں نہ صرف اردو زبان کا بلکہ برِصغیر کا دوسرا سب سے بڑا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ جوش کے علاوہ مجاز ردولوی (متوفی ۱۹۰۰ء) جن کی تمام عمر لکھنؤ میں گزری اور یہیں سپردِ خاک ہوئے، ملّا صاحب کے دوسرے معاصر نظم گو ہیں جن کی نظموں نے انھیں بھی جوش کی طرح زندگانی دوام عطا کر دی ہے۔ ان دونوں عظیم نظم گویوں کے کامیاب نظم گو بننے میں بہت کچھ دخل ان کی زبان کا ہے جو لکھنؤ کی دین ہے۔ اس دور کے تقریباً تمام اہم شعرا وہ حضرات ہیں جو اپنے سے بزرگ تر شاعروں کے شاگرد اور ان سے فیض اٹھانے والے ہیں۔ چناں چہ اثر، حکیم آشفتہ، جوش سب عزیز کے شاگرد ہیں اور ان سے جونیروں میں عمر انصاری بھی گلستانِ عزیز ہی کے ایک پھول ہیں۔ اگر چہ ملّا صاحب خود کسی کے شاگرد ہونے کا ذکر نہیں کرتے لیکن ان کے ایک قریبی معاصر کے بقول وہ بھی کبھی کبھی صفی صاحب سے مشورہ کیا کرتے تھے (خدا جانے اس میں کتنی حقیقت ہے)۔ اس دور کے یعنی ملّا صاحب کے ہم عمر معاصرین کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں:

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی انور حسین آرزو کے علاوہ لکھنؤ کے سب سے بڑے زبان داں اور استاد تھے۔ اعلا عہدوں پر متمکن رہے اور نہایت قابلِ احترام شخصیت کے مالک تھے۔ اثر کی غزلوں کے علاوہ ان کے منظوم ترجمے بھی اردو زبان و ادب کا قیمتی اثاثہ بن گئے۔ ان کے چند شعر پیش ہیں۔ اثرستان، بہاراں اور نو بہاراں تین مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔

عدم سے دارِ فانی میں دلِ مشکل پسند آیا
مسافر کو خیالِ دوریِ منزل پسند آیا

جہاں معمور ہے جلووں سے لیکن کیا تماشا ہے
نگاہِ ذوق پیما کو دلِ بسمل پسند آیا

منشا نہیں کچھ اور پریشاں نظری کا
آئینہ ہے مشتاق تیری جلوہ گری کا

چشمِ مخمور! سچ بتا دل کو
تو نے توڑا کہ آپ ٹوٹا ہے

اک آن میں بارونق اک آن میں ویرانہ
آئینۂ ہستی ہے میرا دلِ دیوانہ

جھنکار ہے شیشوں کی یا ٹوٹے ہوئے دل ہیں
لوٹے لیے جاتے ہو تم رونقِ میخانہ

لیے حشر ان کا شباب آگیا
سوا نیزے پر آفتاب آگیا

آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
تب دل کو مسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

خمخانۂ حیات سے رندانِ بادہ مست
پیتے پلاتے دھوم مچاتے چلے گئے

نہا کر نکھرنا ترا یاد
پسینے میں ڈوبا گلاب آگیا

اتنے ذرا سے آپ ہیں، اتنا ذرا سا دل
میرا کسی نے نام لیا، آپ ڈر گئے

بزمِ طرب میں دیکھ کے مجھ کو پھیر لیں نظریں ساقی نے
میرے لیے تھے زہرِ ہلاہل رس کے بھرے پیمانے دو

ارے توبہ کسی کا مائلِ دیدار ہو جانا
اور اس پر قہر محوِ شوخیِ گفتار ہو جانا

میرا ذمہ، حشر تک اچھے نہ ہوں گے وہ مریض
آپ اپنے ہاتھ سے جن کو دوا دینے لگے

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں
جیسے کچھ اختیار ہے اپنا

ان پہ ہنسیے جو کرم پر مائلِ فریاد ہیں
ان سے ڈریے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

چند قسمیں جنوں کی ہیں ناصح
تجھ کو سوادِ وعظ و پند ہوا

اثر کو وہ خنجر سے دھمکا رہے ہیں
وہی، اپنے سایے سے ڈر جانے والے

عشق و ہوس میں فرق ہے اتنا ہی اے اثر
دیوانہ ہو گیا کوئی دیوانہ بن گیا

لے تیرا کام اے دلِ دیوانہ بن گیا
عالم تمام جلوۂ جانانہ بن گیا

اپنا طالب ہو اگر اس کی تمنا ہے اثر
تو ہی جلووں کا خلاصہ ہے خبر تجھ کو نہیں

شمعِ خاموش کی طرح زندہ کوئی رہا تو کیا
رازِ حیات ہے نہاں سوز کے ساتھ ساز میں

عقل شکارِ ہوش تھی، ہوش ہلاکِ آرزو
درد نے روح پھونک دی پیکرِ امتیاز میں

ذوقِ فنا میں بیخودیٔ عشق کی پردہ دار ہے — درد مجھے ستائے کیوں، ہجر مجھے رلائے کیوں
فلک کی پستی تھی جس کو آسماں سمجھا تھا میں — گردِ راہ کارواں تھی، کہکشاں سمجھا تھا میں
تجھے کرنا ہے جو کچھ آج کر لے — کہ پھر یہ روزگار آئے نہ آئے
رحم پر غیر کے جینا کیا؟ — زندگی کا یہ قرینہ کیا؟
جنّت سکونِ قلب ہے، اب اس کا کیا علاج — زاہد کے واسطے وہ غمِ حور ہو گیا
عشق ہم آغوشِ منزل ہو گیا — عقل بس دو گام چل کر رہ گئی
وضع کا پاس، آبرو کا لحاظ — ہیں یہ کس روزگار کی باتیں؟

حکیم سیّد علی آشفتہ خاندان اجتہاد کے فرد، خاندان فرنگی محل کے عزیز ترین دوست، راقم الحروف کے چچاؤں کے محترم دوست اور خود راقم کے انتہائی مشفق بزرگ، لکھنوی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر، حکیم حاذق تھے۔ لکھنؤ میں حالات خراب ہونے کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے اور نظامیہ طبیہ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ افسوس ہے کہ انتہائی قرب کے باوجود آشفتہ صاحب کے زیادہ اشعار نہ جمع کر سکا۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں : ؎

بھرم کھو دیا ورنہ موسیٰ سے زائد — ہم اپنے میں تابِ نظر دیکھتے
اللہ ری کوہکن تری بیدار مغزیاں — وحشت میں بھی خیالِ رسوم و قیود تھا
آتی ہے درس گاہِ محبت سے یہ صدا — موج جہاں میں حرفِ وفا بے وجود تھا
لو انھیں شاخوں میں جھولے جھولتی ہیں بجلیاں — جو مجھے سونپی گئی تھیں آشیانے کے لیے
طور و موسیٰ سے عیاں نیرنگِ جذبِ حسن ہے — ایک تو بیخود ہوا اور اک سراپا جل گیا
اب انتہا یہ ہے کہ سراپا میں درد ہوں — وہ ابتدائے عشق تھی جب دل میں درد تھا
اتنا کھلا ملا بڑھا عشق کے سوز و ساز میں — فرق نہ کر سکی نظر ناز میں اور نیاز میں
بندے کو کہہ دیا خدا اف یہ فریبِ دوستی — خاک اٹھا کے جھونک لی دیدۂ امتیاز میں

جعفر حسین منظر لکھنوی انتہائی شریف النفس، نرم گفتار اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کا تعلق بھی اسی "ینگ پارٹی" سے تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام منظرستان کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔ خالص تغزل دیکھیے : ؎

خونِ دل ہوتا ہے جل جل کے رگوں میں پانی   جب کہیں آنکھ کو اک اشک بہم ہوتا ہے
آئے ہیں میت پہ تو شوخی سے یہ کہتے ہوئے   مر گیا بیمار اور یہ چارہ گر دیکھا کیے
کس کا کوچہ ہے، آ گیا ہوں کہاں   یاں تو کچھ نیند آئی جاتی ہے
بیخود ایسا کیا خوفِ شبِ تنہائی نے   صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے
حسبِ منشا دلِ پرشوق کی باتوں کا جواب   دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے
پوچھنے والے بھری بزم میں قاتل کو نہ پوچھ   نام تیرا ہی اگر لے دیا سودائی نے
مرگِ عاشق پر فرشتہ موت کا بدنام تھا   وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا
پیدا جو ہوا خوفِ رسوائی جانانہ   دنیا کے دکھانے کو میں بن گیا دیوانہ
مرنے پہ بھی کام آئی شمعِ شبِ تنہائی   اٹھ کر میری بالیں سے تربت پہ چلی آئی
پھر منہ سے "ارے" کہہ کر پیمانہ گرا دیجے   پھر توڑیے دل میرا، پھر لیجے انگڑائی
مٹانے والے! ہمارا ہی گھر مٹانا تھا   چمن میں ایک سے ایک اچھا آشیانہ تھا
سونے ہے کچھ میرے نالوں میں نہ کوئی ساز ہے   پھر بھی سن لیجے تو دل ہل جائے وہ آواز ہے
خونِ دل ہوتا ہے، ہونے دیجیے   اب رُلایا ہے تو رونے دیجیے
ہر قطرۂ خوں حشر میں فریاد کرے گا   تم خوش ہو کہ ناوک پہ مرا نام نہیں ہے
بہکی بہکی نگہِ ناز خدا خیر کرے   حسن میں عشق کے انداز خدا خیر کرے
مہربان اور نگہِ ناز! خدا خیر کرے   اتنے بدلے ہوئے انداز خدا خیر کرے
کیا ہوا پچھلے پہر راتوں کو رونے والے   آج آتی نہیں آواز خدا خیر کرے
یہ پناہِ قفس تنگ بھی جاتی ہے آج   کھل رہے ہیں پرِ پرواز خدا خیر کرے
شب کے نالوں کا سبب پوچھنے آتا ہے کوئی   آج پہچان لی آواز، خدا خیر کرے
شوق دیدار بہت، دید کا مقدور نہیں   اور مزہ یہ ہے کہ وہ دل میں ہے کچھ دور نہیں
حسنِ سیرت تلاش کر لے دل   حسنِ سیرت پہ واہ واہ نہ کر
خون کی سی چیز کر دینا پڑی پانی مجھے   پھر بھی یہ بیداد گر دنیا نہ پہچانی مجھے
محبت سے توبہ! ارے توبہ توبہ   محبت پہ ہے میرا ایمان منظر

چلے جاتے ہیں اے پیرے منہ چھپائے — بڑے سیدھے سادے مسلماں نظر
رگوں میں دوڑنا پھرنا عذاب ہو جائے — نہ اتنی پی کہ لہو بھی شراب ہو جائے
نہ آشیاں ہے نہ آزادیاں نہ بال و پر — میں کس امید پہ مانگوں دعا، بہار آئے

امۃ الفاطمہ مخفی لکھنوی (۱۹۰۲ء تا ۱۹۵۳ء) پردہ نشیں خاتون تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر گئیں۔ پختہ کلام شاعرہ تھیں۔ نمونۂ کلام پیش ہے۔ مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

وسعتِ دل ارے معاذ اللہ — ساری دنیا سمائی جاتی ہے
پردہ ہے اک بقا کا، راز فنا نہ پوچھو — مر کر بھی ساتھ ہم سے چھوٹا نہ زندگی کا
خدا کے بھروسے پہ چھوڑی ہے کشتی — نہ گرداب دیکھا، نہ طوفان جانا
وہ چھپنا ترا پردۂ رنگ و بو میں — وہ ہر رنگ میں میرا پہچان جانا
وفا ابتدا ہے وفا انتہا ہے — خلاصہ ہے بس یہ مری داستاں کا
جلا آشیاں جب سے دل مطمئن ہے — نہ بجلی کا قطرہ نہ دھڑکا خزاں کا
بہت جستجو کی، بہت خاک چھانی — کدھر ہے تو اے جلوۂ لامکانی
عشق کی فطرت نے یوں بدلا مذاقِ زندگی — جتنے غم بڑھنے لگے اتنی خوشی ہونے لگی
یوں بے حجاب ہیں کہ ہیں جیسے حجاب میں — اس بزم میں کسی کو مجالِ نظر کہاں
عشق کی اللہ رے فتنہ کاریاں — پاک دامن چاک دامن ہو گئے
یوں منظرِ ہستی پہ تری چھا گئیں آنکھیں — اک کیف سا ہر چیز پہ برسا گئیں آنکھیں
جس کو عبرت دلائی جاتی ہے — میری صورت دکھائی جاتی ہے
ہر بات کا احساس مرے دل سے مٹا دے — زندہ مجھے رکھنا ہے تو دیوانہ بنا دے
بکھری ہر سو پڑی ہیں زنجیریں — جوشِ رنگینیٔ بہار نہ پوچھ
مرا آنا جہاں میں منحصر تھا اتنی باتوں پر — جفا سہنا، وفا کرنا اور اس کے بعد مر جانا

حکیم دانش اثر لکھنوی کے خاص ملنے والے تھے اور انھیں کے یہاں نشست رہتی تھی۔ بہت غربت میں زندگی بسر کی لیکن وضعداری میں فرق نہ آنے دیا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ اسی عہد کا یہ شعر ہے جس نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا:

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ میخانے کو — آخری دور ہے، بھر دے کوئی پیمانے کو

دانش کے چند شعر اور پیش ہیں: ؎

پیش نظر تھی تفرقہ پردازیِ فلک — تم کو کبھی گلے بھی لگایا تو آہ کی
دیکھوں میں ترا جلوہ کس جا نظر آتا ہے — آنکھ اٹھتی ہے جس جانب پردا نظر آتا ہے
میخانے کا دروازہ کیوں بند ہوا اے واعظ — ہر وقت درِ توبہ جب وا نظر آتا ہے
بے ہوش کیا جس نے دیدار کے طالب کو — مجھ کو اسی قاتل کا جلوہ نظر آتا ہے
کیا دیکھیں خدا جانے اللہ کے گھر جا کے — میخانے سے جب ہم کو کعبہ نظر آتا ہے

سراج الحسن سراج ملا صاحب کے تقریباً ہم عمر اور عزیز دوست اور مداح۔ متذکرہ "ینگ پارٹی" کے ایک اہم کارکن۔ مجموعۂ کلام "شعلۂ آواز" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ چند اشعار نموناً پیش ہیں: ؎

اک مسلسل خوابِ بیداری میں کٹ جاتی ہے رات — نیند آئے یا نہ آئے سویا کرتے ہیں ہم
نذرِ غم شاید ہر اشک خونچکاں کرنا پڑے — کیا خبر کتنی بہاروں کو خزاں کرنا پڑے
دیا ہے درد تو رنگِ قبول دے ایسا — جو اشک آنکھ سے ٹپکے وہ داستاں ہو جائے
یہ آدھی رات، یہ کافر اندھیرا — نہ سوتا ہوں نہ جاگا جا رہا ہے
نہ پی سکو تو ادھر آؤ، پونچھ دوں آنسو — یہ تم نے سن لیے اس دل کے سانحے کہاں
یہ جزر و مد ہے، پاداشِ عمل اک دن یقینی ہے — نہ سمجھو خونِ انساں بہہ گیا ہے رائیگاں ہو کر
شگاف ڈال دو تاریکیوں کے سینے میں — ہوا کے رخ پہ ہوں نامے، سحر کی بات کرو
انسانیت کے خون سے ہولی تو کھیل لی — تاریخ باز پرس کرے گی بہار سے
ذرا دیکھو یہ سرکش ذرۂ خاک — فلک کا چاند بنتا جا رہا ہے
آنسو ہیں کفن پوش ستارے ہیں کفن رنگ — لو چاک کیے دیتے ہیں دامانِ سحر ہم
سوتا رہا ہونٹوں پہ تبسم کا سویرا — رو رو کے جگاتے رہے تقدیرِ سحر ہم
یہ بے بسی ہماری یہ بے حسی ہماری — اقدامِ خودکشی ہے یا زندگی ہماری
اک کافرِ مطلق ہے ظلمت کی جوانی بھی — بے رحم اندھیرا ہے شمعیں ہیں نہ پروانے

نہ آج تک انھیں سوجھا نگاہِ یاس کا توڑ   یہیں پہ بس انھیں بے اختیار دیکھا ہے

چاند سورج کے ڈھالنے والو   چھیڑ و امن و امان کے افسانے

رات بھر شمع جلاتا ہوں بجھاتا ہوں سراجؔ   بیٹھے بیٹھے یہی شغلِ شبِ تنہائی ہے

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے   اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے   لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

ظاہر پرست ظالم یہ بھی خبر نہیں ہے   کہتا ہے آنسوؤں میں خونِ جگر نہیں ہے

حواس و ہوش پہ بجلی گرا کے لوٹ لیا   ہنسی ہنسی میں مجھے مسکرا کے لوٹ لیا

جنوں ہے بے نیازِ کج کلاہی   یہاں بے تاج کے ہوتی ہے شاہی

چند تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو   بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنا پڑے

دل بھی تمھارا ہم بھی تمھارے   اچھّا تم جیتے ہم ہارے

الٹی دیکھیں عشق کی راہیں   ہنسنا پڑے جب رونا چاہیں

ابوالفضل شمسؔ لکھنوی سراجؔ و آشفتہؔ کے ساتھیوں میں تھے۔ مرتبۂ استادی پر فائز تھے۔ لائق شاگردوں کی ایک جماعت اب بھی موجود ہے جو ایک ادبی انجمن بزمِ شمس چلا رہے ہیں۔ شمسؔ صاحب کے شاگردِ رشید اسلم لکھنوی خود بھی استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ چند شعر نمونتاً پیش ہیں۔

اٹھے جو لطفِ دید تو باہم دگر اٹھے   ان کی نظر کے ساتھ ہماری نظر اٹھے

طے کی ہیں گردِ راہ کی صورت مسافتیں   بیٹھے ہیں اٹھ کے ہم تو کبھی بیٹھ کر اٹھے

یہ دور چاہتا ہے ابھی اور انقلاب   حشر آج اٹھے چاہے کل اٹھے، مگر اٹھے

دیکھے ہیں ہم نے سیکڑوں دنیا کے انقلاب   محشر اگر اٹھے تو سمجھ بوجھ کر اٹھے

وہ چلتے چلتے کہہ گئے تسکین کے لیے   مجھ کو پکار لینا جو دردِ جگر اٹھے

حشر میں دیکھ کے مایوسیِ قاتل میں نے   عمداً ٹال دیا تذکرۂ دل میں نے

ہم زندہ جہاں زندہ ہم مردہ جہاں مردہ   ہوتی ہے نظر جیسی ویسا نظر آتا ہے

ہے شمع بھی بستر بھی، اپنے بھی پرائے بھی   بیمار ہیں ہم جب، گھر سونا نظر آتا ہے

جو کوئی آئے گا وہ شمع جلائے گا ضرور   اس لیے قبر بنائی سرِ منزل میں نے

سید آل رضا رضاؔ انجمن بہارِ ادب کے خاص رکن۔ اس انجمن کے سکریٹری ایک سال ملّا صاحب اور دوسرے سال آل رضا صاحب ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ترکِ وطن کر گئے۔ منظر صاحب کے ساتھ دوسرے خالص زبان کے شعر کہنے والے تھے۔ رنگِ تغزل ملاحظہ ہو:

دل کا سودا ہمیں نہ راس آیا   جی نہ بہلا کسی بہانے سے
دل تجھ کو دُکھاتا ہے ابھی اور زیادہ   اللہ کرے تیری خوشی اور زیادہ
دیکھی ہے بہت راہ، بہت دی ہیں صدائیں   اب عالمِ تکمیل ہے کہہ دو کہ نہ آئیں
اک شمع ہے منجملۂ اسبابِ شبِ غم   اے مصلحتِ وقت جلائیں کہ بجھائیں
وہ پہلی چوٹ وہ احساسِ آمد آمدِ عشق   اٹھا جو درد تو دل نے کہا مبارک ہو
اے رضاؔ پڑھ لو محبّت کی نمازِ آخر   عصر کا وقت ہے خورشید لبِ بام آیا
رضاؔ وہ آ چکے، اٹھو خدا کو یاد کرو   کہ وقت آ گیا تاروں کے جھلملانے کا
میں نہ ہوں گا دیکھنے کو وہ قریب ہے زمانہ   جو بنا رہے ہو حالت تمہیں آ کے دیکھ جانا
اے خلوتِ تصوّر یونہی پردہ دارِ جلوہ   تمھیں چھین لیں گی نظریں کہیں سامنے نہ آنا
آج کیوں اجڑے ہوئے دل میں وہ آئے ہیں رضاؔ   آج کیوں پھول کھلایا گیا ویرانے میں
دل کی رنگت نہ تم نے پہچانی   خون اشکوں کا بن گیا پانی
دیکھ رہے ہو دل کی حالت   پوچھ رہے ہو آگ لگائیں
اس نے آنکھوں سے ادا کی تھی رضاؔ رسمِ سلام   دیکھنا ہوگا کوئی ہاتھ اٹھاتے نہ بنا
یہ محبّت ہے محبّت ہے محبّت ہے رضاؔ   پیارے اس کو تو قرینے سے سنوارا ہوتا
نہ رکھّا کہیں کا نہ اپنا بنایا   وہ کیا چاہتے ہیں سمجھ میں نہ آیا
بس یہی تھا ان کو بہتر دل پہ ناز   ظلم فرمائیں، ترس کیوں آ گیا
رضاؔ بس زندگی اتنی ہی تھی اور سب تماشا تھا   نہ آنا تھا نہ جینے کا مزہ پھر عمر بھر آیا

جوشؔ ملیح آبادی ملّا صاحب کے تقریباً ہم عمر معاصرین کا ذکر بغیر ذکرِ جوشؔ ملیح آبادی کے نامکمل ہو گا۔ بحیثیت نظم گو جوشؔ کا اردو ادب میں جو مرتبہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے

لیکن ان کی غزلوں کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں : ؎

سمجھتے ہیں مآلِ گل مگر جبرِ قدرت ہے سو ہوتے ہی غنچوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے
ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے
جو ہو سکے گا تو رک دوں گا عذابِ روزِ حساب تیرا پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی اور ہم نے وقایع کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا
اب دل کا سفینہ کیا ابھرے طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں اب بحر سے کشتی کیا کھیلے موجوں میں کوئی گرداب نہیں

ملاؔ صاحب کے متذکرہ سینیر اور ہم عمر معاصرین کے علاوہ اس عہد میں سیکڑوں دوسرے شعر کہنے والے تھے جن کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے قدیم لکھنوی روایات ہی پر گامزن رہنا مناسب سمجھا۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش ہیں : ؎

رازؔ لکھنوی ـ یہ بھی انھیں اساتذہ میں تھے جو قدیم رنگِ سخن کو اختیار کیے ہوئے تھے :

رازؔ اس دیر و حرم کا ایک ہی انجام تھا کوئی در ہوتا مگر سجدے سے ہم کو کام تھا
نزع میں آئے تو وہ جن کا مسیحا نام تھا اور شفا دینا نہ دینا، یہ خدا کا کام تھا
خود ہوئے بیہوش بھی اور طورِ سینا بھی جلا بے محل کی ضد کا اے موسیٰ یہی انجام تھا
بے خودی ہو یا خودی ابھی جدھر میری نظر ذرّے ذرّے پتّے پتّے پر تمھارا نام تھا
رازؔ ہم نے زندگی اور موت کر دی نذرِ حسن داغِ دل آغاز تھا، داغِ جگر انجام تھا

ہلالؔ لکھنوی :

دید کا ارمان اے موسیٰ خیالِ خام تھا ہمت دل کے لیے گہری نظر کا کام تھا
کوئی مجنوں ہو گیا مشہور کوئی کوہکن منزلِ الفت میں ہر اک کا جدا اک کام تھا
میں کسی کا طالبِ دیدار ہوتا کس طرح حضرت موسیٰ کا سب پیشِ نظر انجام تھا
اپنی تکلیفوں کا پھر احساس ہوتا کس طرح منحصر ان کی خوشی پر جب ہر اک آرام تھا
پرزے پرزے کر کے میرے خط کے بھیجے اے ہلالؔ جس نے دل ٹکڑے کیے ظالم کا وہ پیغام تھا

گرؔ لکھنوی :

اس کی رحمت اور اس کی سرفرازی کے نثار　　کچھ نہ تھا عصیاں فقط الزام ہی الزام تھا

ذاکر لکھنوی۔ اساتذۂ لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے۔ چند شعر پیش ہیں:-

غم مجھ کو گوارا جو نہیں ہم سفری کا　　منھ دیکھ کے روتا ہوں چراغِ سحری کا

مشہور جہاں شام جوانی کی ہیں نیندیں　　سنتے ہیں زمانہ ہے ابھی بے خبری کا

اب تک ہے کہاں تو کہ دو عالم سمٹ آئے　　وقت آ گیا محشر میں تری جلوہ گری کا

ہے یاد ابھی تک مجھے رفتارِ جوانی　　وہ جھوم کے چلنا وہ قدم بے خبری کا

الٹو کہ نہ الٹو رخِ پُر نور سے پردہ　　ذاکر نے اثر دیکھ لیا جلوہ گری کا

کوثر لکھنوی:

چہرہ اداس قلب و نظر زندگی اداس　　یہ حال ہو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

یوسف لکھنوی:

یا در رکاب بیٹھے ہیں اس انتظار میں　　ہم کو بھی لے لے اب جو کوئی کارواں چلے

افتخار مرزا ہنر:

ہم بے بسی پہ اپنی قفس میں تڑپ گئے　　جب ہم سفر اڑ کے سوئے آشیاں چلے

ہر فصل میں تھے چاک گریباں کیے ہوئے　　ہم کو تو امتیاز بہار و خزاں نہ تھا

منے آغا فاضل:

مہر و وفا کے چرچے کل ان کی بزم میں تھے　　میرا بھی نام آیا لیکن کہیں کہیں پر

منے آغا آفتاب:

اٹھ رہی تھی لاش میری ہر طرف ہنگام تھا　　ایسے موقع پر بھی ہنس دینا تمہارا کام تھا

مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی ملا صاحب کے بچپن میں استاد تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے جن کا مطبوعہ کلام موجود ہے۔ چند شعر نمونتاً پیش ہیں:-

نہ رکتا میں تو دشواری یہ تھی گھٹتا تھا دام میرا　　خفا اب ضبط گریہ ہے کہ کیوں کھویا بھرم میرا

قضا کیا مجھ کو لائی ہے زمیں کوئے قاتل پر　　الٰہی خیر کرنا کیوں نہیں اٹھتا قدم میرا

بالیں سے مری ہو کے خفا اٹھ گیا وہ بت　　اتنا کہا تھا شکر ہے پروردگار کا

وہ پھر اسیرِ گیسوئے جانانہ ہو گیا — کمبخت آکے ہوش میں دیوانہ ہو گیا

بندہ خدا کا عاشق شیدا بتوں کا ہوں — کیوں کر میں چھوڑوں سجد و زنّار کی تلاش

آپ آگئے تو اب مجھے کوئی الم نہیں — صدمہ نہیں، ملال نہیں، درد و غم نہیں

محال ہے نہ گھٹے بدر اور ہلال نہ ہو — کمال ہی وہ ہستی ہے جسے زوال نہ ہو

اتنا تو ربط اور دلِ الفت شناس ہے — ظاہر میں گو وہ دور ہے باطن میں پاس ہے

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے دورِ ملّا ایک طویل زمانہ ہے۔ اس زمانے کے تیسرے دور کے وہ شعرا حضرات ہیں جو ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ سے لے کر ۱۹۳۰ء تک اس عالمِ آب و گل میں آئے۔ اس دور کے شعرا کے خصوصیاتِ کلام بھی تقریباً وہی ہیں جو اُن کے سینیر معاصرین کے ہیں لیکن ان کے برخلاف ان کی توجّہ نظم کی طرف ان کے بہ نسبت کم رہی۔ یہ حضرات عموماً غزل گو ہیں جن کی شاعری ان الزامات سے قطعی طور سے مبرّا ہے جس کے لیے لکھنؤ بدنام ہے۔ حسن و عشق غزل کے خاص موضوع ہیں۔ چناں چہ اس دور کے شاعروں کے بھی محبوب موضوع یہی ہیں لیکن مسائلِ حیات اور معاملاتِ روزگار کی ادائیگی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن کے کلام میں فکر و تخیّل کی بلندی نظر آتی ہے استعاراتی اندازِ بیان، فصاحت اور لطافتِ زبان کی طرف ان کی بھی توجّہ رہی اور اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں کے سچّے مقلد ہیں۔ ان کے کلام کی چند مثالیں پیش ہیں:

سالک لکھنوی (پیدائش: ۱۹۱۰ء، وفات: ۱۹۷۶ء) اساتذۂ لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے۔ خالص تغزل اور لطافتِ زبان سالک صاحب کے کلام کے خصوصیات ہیں۔ ان کے بھائی ماہر لکھنوی نے ان کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ اشعار شائع کر دیے ہیں۔ چند شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں:

آپ تو آپ ہیں، یہ بھی مرے امکاں میں نہیں — دو گھڑی بیٹھ کے تقدیر سے شکوہ کر لوں

ساقیِ روزِ ازل یاد تو ہوگا تجھ کو — کس نے پیمانہ اٹھایا تھا ادب سے پہلے

دو پھول ایک شاخ سے ٹوٹے مگر نصیب — کوئی گلے کا ہار کوئی پائمال تھا

ذوقِ فریاد بہ اندازۂ غم ہے کہ نہیں — یعنی اب بھی مجھے احساسِ کرم ہے کہ نہیں

عطا کر دو مجھے بے چینیاں آرام سے پہلے
بدل دو میری دنیا زندگی کی شام سے پہلے

آج بھی میں ہوں گوش بر آواز
جیسے وہ ہم کلام ہے اب تک

نگاہِ شوق سے لاکھوں بنا ڈالے ہیں در ہم نے
قفس میں بھی منافی شکستِ بال و پر ہم نے

اتفاقِ وقت ہے دونوں ہیں ساتھ
ورنہ یہ دنیا کہاں اور ہم کہاں

جن کے اجزا سے ہو تعمیرِ حیات
ملتے ہیں ہر اک کو ایسے غم کہاں

کھنک جاتے ہیں جب ساغر تو برسوں کان بجتے ہیں
ارے توبہ بڑی توبہ شکن آواز ہوتی

محبت کے شعلوں نے دونوں کو پھونکا
نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں پانی

سمجھو تو بہت کچھ ہے نہ سمجھو تو نہیں کچھ
فریاد سے کچھ کم نہیں فریاد نہ کرنا

میں ہوں اور سہمی ہوئی میری نگاہ
شب کا سناٹا ہے اور تنہائیاں

کسی طرح تو بدل جائے زردیِ رخسار
چھڑک رہا ہوں لہو زندگی کے چہرے پر

ہمارا حال تھا، ہم جانتے تھے، ہم پہ گزری تھی
جو ہم کہتے تو لطفِ داستاں کچھ اور ہو جاتا

ابھی سے آپ کی آنکھوں میں آنسو
ابھی تو اپنی کہانی کہی نہیں میں نے

نگاہ مہر کہاں کی، وہ برہمی بھی گئی
میں دوستی کو جو رویا تو دشمنی بھی گئی

ہوں قفس میں مگر اڑنے کا گماں ہوتا ہے
دل دھڑکتا ہے تو جنبشِ پرِ پروازی ہے

ابر میں مضطر ہے بجلی مسکرانے کے لیے
آگ پیدا ہو رہی ہے آشیانے کے لیے

چاہا تھا ٹھوکروں میں گزر جائے زندگی
لوگوں نے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹا دیا

لحد پہ آئیے، اب کون سا تکلف ہے
کبھی بشر تھا، مگر اب تو راستا ہوں میں

مرا ہی کام ہے راہِ وفا میں اے سالک
قدم جما کے جو کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں

سید نواب افسر (پیدائش: ۱۹۰۹ء، وفات: ۱۹۸۱ء) لکھنؤ کے صاحبِ فکر استاد شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام "غمِ حیات" میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ نمونۂ کلام پیش ہے: ؎

زیست کے دھوپ میں پتوار کے گرتے ہیں کچھ لوگ
منھ نہ دیکھو، انھیں دامن کی ہوا دو یارو

دھوکے نمودِ صبح کے رہ رہ کے کھائے ہیں
سو مرتبہ چراغ جلائے بجھائے ہیں

دنیا ہے یہ، دلسوز یہاں کوئی نہیں ہے
پروانے بہت، شعلہ بجاں کوئی نہیں ہے

آجائے تو آجائے کوئی صاحبِ دل اور
فی الحال جہاں ہم ہیں وہاں کوئی نہیں ہے

ایسے بھی ہیں کچھ دشت جہاں ملتے ہیں انساں
ایسے بھی ہیں کچھ شہر جہاں کوئی نہیں ہے

خیر، کچھ ہوش تو آیا ہمیں، آنکھیں تو کھلیں
انقلاباتِ زمانہ کو دعا دو یارو

جب انسان سانس لیتا ہے کثافت کی فضاؤں میں
تو دل میں جو خیال آتا ہے وہ بیمار آتا ہے

وہ روشنی جو اندھیرے پہ مسکراتی ہے
کبھی وہ خود بھی اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے

دیکھ کر کہتے ہیں سب، ہے یہ خدا جانے کون
جسم پر سر ہی نہیں ہے، مجھے پہچانے کون

آگ ہے آگ، کہاں جاتا ہے مرنے کے لیے
شمع میں تجھ کو نظر آتا ہے پروانے کون

آئے دنیا میں تو سب کچھ ہمیں دنیا نے دیا
کبھی شعلوں کی لپک اور کبھی دامن کی ہوا

مرے جذبے کو نئی روح عطا کرتی ہے
یہ مری سعیِ مسلسل یہ شکستِ پیہم

تخریب سی تخریب ہے، پتھراؤ سا پتھراؤ
اس دور میں سب بھول گئے شیشہ گری لوگ

تم ان سے آگ لگانے کا کام لیتے ہو
چراغ ہم نے جلائے تھے روشنی کے لیے

زندگی کے ان مسلسل تجربوں کے باوجود
آدمی سمتِ سفر اپنی بدلتا ہی نہیں

انھیں تلخیوں سے مجھ کو یہ شعورِ غم ملا ہے
مجھے دے گئے بہت کچھ مرا دل دکھانے والے

ہر قدم پر کارواں کو اک نیا رہزن ملا
اور ہر رہزن امیرِ کارواں بنتا گیا

غزل نے صرف غمِ دل پہ اکتفا کب کی
غمِ حیات کی زلفوں کو بھی سنوارا ہے

جہاں دن گزارے وہی اپنا گلشن
جہاں تھک کے بیٹھے وہی آشیانہ

کچھ انکارِ ماضی، کچھ امیدِ فردا
یونہی زندگانی بسر ہو رہی ہے

ہمیشہ کے لیے فطری تقاضے کس نے روکے ہیں
سلامت شوقِ آزادی، قفس کی تیلیاں کب تک

ہنس کھیل کر گزار دی دو دن کی زندگی
غم کو بھی خوشگوار بناتے چلے گئے

ہر جادہ رہِ زیست کا چلنے کے لیے ہے
گرنا بھی یہاں ہے تو سنبھلنے کے لیے ہے

تباہ کاریِ دورِ خزاں کا غم نہ کرو
نئی بہار شکست چمن سے آئے گی

اچھا تو ہے، یہ تلخ حقیقت نہاں رہے
ان کی جفا یہ ہم کو وفا کا گماں رہے

اللہ یہ انساں کا مقتل ہے کہ دنیا — اس وادیِ پُر خوف کو چمن کون کہے گا
پینا ہو جسے پی لے، کیا ٹھیک ہے ساقی کا — کس وقت نگاہوں کے انداز بدل جائیں
کیوں اے دلِ غیور غلامی کی ذلتیں — آزادیوں کے بھیس میں آئیں تو کیا کریں
کوئی سایۂ شجر بھی مری راہ میں نہیں ہے — مرے ساتھ کیا چلیں گے مرے ساتھ آنے والے
یہ کون دیکھتا ہے کہ مے بوند بھر نہیں — سب دیکھتے ہیں دور میں پیمانہ آگیا
سنتا ہی کہاں ہے کوئی دیوانے کی باتیں — دیوانہ اگر راز کا محرم ہے تو کیا ہے
محبت نے فطرت کی دنیا بدل دی — وہ غم دے رہے ہیں، خوشی مل رہی ہے

محمد عمر انصاری (پیدائش: ۱۹۱۲ء) لکھنؤ کے موجودہ شعرا میں ملّا صاحب کے بعد سب سے سینیر شاعر ہیں اور مرتبۂ استادی پر فائز ہیں۔ کلام متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ چند شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں:ـــ

روشنی بخش کے دنیا کو پگھلتے رہنا — ہم چراغوں کا تو ہے کام ہی جلتے رہنا
پھاڑے ہوئے اک خط کے پرزے بھی عجب شے ہے — رکھے بھی نہیں جاتے، پھینکے بھی نہیں جاتے
کیا چیز ہے نہ جانے یہ مجبوریِ حیات — کٹتے ہوئے ملے مجھے کچھ لوگ دن کو رات
کوئی ذوقِ عمل پیدا تو کرے زندگانی میں — حیاتِ جاوداں بھی ہے اسی دنیائے فانی میں
تڑپتے ہی رہے آنکھوں میں آنسو — ہنسی دیتی رہی جھوٹی گواہی
طوفان جب اٹھا تھا اس وقت نہ تھا کوئی — اک بھیڑ ہے ساحل پر جب ڈوب گیا کوئی
سُن سکے تو جو صدا رات کے سنّاٹے کی — خامشی بھی در و دیوار کی افسانہ ہے
ختم کر دیے ہم پر رہزنی کے فن سارے — رات اس کی یادوں کو مل گئے تھے ہم تنہا
اس کا بھی احتساب ضروری ہے اے عمر — دنیا کو تو نے کیا دیا دنیا سے کیا لیا

باتیں جو بہت بنا رہے ہو — کیا بات ہے جو چھپا رہے ہو
تم اور یہ مدح دشمنوں کی — کس دوست سے مل کے آرہے ہو
باتوں کا کوئی رُخ ہو نگاہوں کی کوئی سمت — میں خوب سمجھتا ہوں کدھر رُخِ سخن ہے

شوق جینے کا، نہ مرنے کا الم ہے ہم کو
ہم کو سمجھا ہی نہیں کوئی، یہ غم ہے ہم کو

تن پر لباسِ زر ہے نہ سر پر کلاہِ کج
ہم سے کوئی ملے بھی تو کیا دیکھ کر ملے

ملتے بھی ہیں وہ اب تو کوئی جیسے اجنبی
ہوتی بھی ہے جو بات تو بس موسموں کی بات

بشر ہے گر تو رکھ شانِ بشر بھی
بھروسہ کر کچھ اپنے آپ پر بھی

ہیں وفائیں کم ہماری جفائیں ان کی زائد
یہ حسابِ دوستاں ہے اسے کون جانتا ہے

کبھی چلا بھی تو بس رہ گیا کتابوں تک
پہنچ سکا نہ زمانہ ہمارے خوابوں تک

پھر کسی دشت میں گلشن میں نہ راہوں میں ملے
پھول کھلتے ہوئے جو اُن کی نگاہوں میں ملے

عرضِ سلام پر مری اس نے جو سر جھکا لیا
اب وہ جواب دے نہ دے، میں نے جواب پا لیا

کچھ بھول بھی جاتا ہوں گنتے ہوئے یادوں کو
ہر بار کی گنتی میں ہو جاتے ہیں کچھ کم بھی

ساری بستی کے لیے ہے بہت اک چنگاری
یوں ہی چلتی رہی کچھ دیر اگر اور ہوا

ممکن ہے بشر ہو، مگر اس شخص کا چہرہ
انداز تو سورج کے گھرانے کے لیے ہے

وہیں پہ بیٹھ گئے کسبِ نور کی خاطر
جہاں ہمیں کوئی جلتا ہوا چراغ ملا

نہ دل کی بات میں سمجھوں، نہ میری بات دل سمجھے
میں اپنی ہی کہے جاتا ہوں اور یہ میرا یارا اپنی

رہ کے خاموش بھی کیا پاؤ گے دنیا سے عمر
ڈھونڈھ ہی لے گا زمانہ کوئی بے بات کی بات

نہال رضوی (پیدائش ۱۹۱۸ء، وفات ۱۹۹۰ء) نبیرۂ جلال لکھنوی خوش فکر شاعر تھے۔ مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ کچھ شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں: ؎

گھر چاند کی دنیا میں بنانے پہ ہے مجبور
اس درجہ اب انسان سے انسان ڈرے ہے

ہر کشمکش کے بعد سنورتی ہے زندگی
خوش ہوں کہ زندگی کا سفینہ بھنور میں ہے

صنم کدے میں بھی دیکھا ہے ان نگاہوں نے
خدا کو ڈھونڈھنے والا خدا کو پاتا ہے

دنیا کی دشمنی کا تو کیا ذکر کیجیے
دنیا نے دوست بن کے بھی مارا کبھی کبھی

اے نوازشِ صیّاد و باغباں کہیے
بہار جب تھی چمن میں تو میں قفس میں تھا

جو ہم اٹھے ہوئے طوفاں سے ڈر گئے ہوتے
تو اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے ہوتے

بڑی خوشی تھی ہمیں آشیاں بنانے کی
بنا چکے تو نظر لگ گئی زمانے کی

—

جہانِ کیف و مستی، کائناتِ رنگ و رعنائی — ارے توبہ کسی کافر کی وہ معصوم انگڑائی
بہار، گل، شراب، جام، زلف و رخ کے تذکرے — نہ انقلاب لائیں گے نہ انقلاب لائے ہیں
جس کا سایہ ہر مسافر سے برتتا ہے خلوص — کتنی بیدردی سے اس دیوار کو ڈھاتے ہیں لوگ
اِتراؤ نہ شیشے کے مکانوں کے مکینو — اس شہر میں پتھر کا بھی بازار لگے ہے
میں ناکامیوں سے ہراساں نہیں ہوں — وہی آج بھی ہیں جو کل تھے ارادے
ساحل کے پاس ڈوب گئی کشتیِ حیات — منزل کے پاس عمر کا پیمانہ بھر گیا

آرم لکھنوی حضرت آرزو کے شاگرد، سالک لکھنوی، عمر انصاری وغیرہ کے ہم عمر اور خوش فکر شاعر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر گئے۔ غزلیات کے علاوہ متعدد نظمیں بھی کہیں۔ چند شعر بطورِ نمونہ پیش ہیں: ؎

ہم باغِ تمنا میں دن اپنے گزار آئے — آئی نہ بہار آخر، شاید نہ بہار آئے
فطرت ہی محبت کی دنیا سے نرالی ہے — ہو درد سوا جتنا، اتنا ہی قرار آئے
کچھ ان سے نہ کہنا ہے، تھی فتح محبت کی — جیتی ہوئی بازی کو ہم جان کے ہار آئے
مٹے ہوؤں کی کوئی یادگار کیا ہوگی — مزار ہی نہیں، شمعِ مزار کیا ہوگی
شکست ساز کا نغمہ ہے التجا میری — سنو، کہ پھر نہ سنو گے کہیں صدا میری
دل اپنا آرم دل ہے، یہ گردِ کدورت کیا — آئینہ ہے آئینہ، دیکھو نہ غبار آئے
تصویر ہی دیکھی تھی اک جانِ تمنا کی — آنسو مری آنکھوں میں کیا سلسلہ وار آئے
جس کی نظروں میں تم نہیں ہوتے — اس کی دنیا سیاہ ہوتی ہے
ہم تو ہر طرح ہو چکے برباد — اب محبت تباہ ہوتی ہے
حسن کی ایک بے گناہ نظر — باعثِ صد گناہ ہوتی ہے
بن کے دشمن بھی دل کو پیارے ہیں — وہ ہر اک حال میں ہمارے ہیں
سختیِ زیست اور کیا ہوگی — نامرادی میں دن گزارے ہیں
درد کیا میرے ڈوبنے کا آرم — ہنس رہے ہیں جو خود کنارے ہیں
شمع پگھلی، رات گزری، خاک پروانے ہوئے — ہم بھی سوچا کیے جم لے ذرا محفل ابھی

جزر و مد میں یوں کہاں بیڑا لگائے ناخدا — ہو تو لے گھٹ بڑھ کے قائم ایک جا ساحل ابھی
آپ ہی ہو جائے گی آسان ہر مشکل ابھی — ہو تو لے تیرا کہے جانے کے قابل دل ابھی
ہر قدم پر تھام بازو یہی کہتا ہے شوق — اٹھ تھکے ماندے مسافر، آتی ہے منزل ابھی
آڑ جس کی لی وہی دیوار سر پہ آ گئی — جس جگہ ڈوبی ہے کشتی تھا یہیں ساحل ابھی

اُدھر یہ سوچ کے بے قصد تیر چھوٹ گیا — اِدھر یہ فکر کہ تھی کون سی خطا میری

اے بیخودیِ سجدہ بنایا ہے یہ کس نے — نقشِ قدمِ یار پہ اک تازہ نشاں اور
اب کس کو آرام سمجھے کوئی رہبرِ منزل — جس شخص سے پوچھو وہ بتاتا ہے نشاں اور

سعیِ پیہم پر حصولِ مدّعا موقوف تھا — اور میں بیٹھا رہا تکیہ کیے تقدیر پر

ہجر ہو یا کہ درد ہو سوز ہو یا کہ ساز ہو — اپنی خوشی سے جو وہ دیں مجھ کو اسی پہ ناز ہو

جستجو میں تری دے دے کے سہارا امّید — اور دیوانہ کیے دیتی ہے دیوانے کو
کیا آرام تیرے نصیبوں کو شبِ غم میں امّید — جل بجھی شمع بھی کہہ کہہ کے سحر ہو کہ نہ ہو

یہ چار تنکے جو کام آئے آشیانے کے — کھٹک رہے ہیں نگاہوں میں کیوں زمانے کے

دل کی وہ تازگی کہاں، اب تو — سوکھی پتّی گلاب کی سی ہے

ضبطِ غم میں، نہ تڑپنے میں، نہ فریاد میں ہے — دل کو چپ بیٹھ کے جو لطف تری یاد میں ہے

مرحبا، مے کی طرح اشک کو پینے والے — لطف اس میں ہے کہ چھلکے نہیں پیمانے سے

جس طرف اب نگاہ ہوتی ہے — تیری ہی جلوہ گاہ ہوتی ہے
جس کی نظروں میں تم نہیں ہوتے — اس کی دنیا سیاہ ہوتی ہے

فضل نقوی (۱۹۱۳ء تا ۱۹۹۱ء) خاندان اجتہاد کے فرد اور ذاکر لکھنوی کے فرزند تھے۔ اساتذۂ لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے۔ قطعات تاریخ پر مشتمل ایک مجموعے کے علاوہ نوحے، سلام، غزلیات وغیرہ کے متعدّد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

حجاب تصور جو چہرے پہ چھائے — کبھی چاند نکلے کبھی ڈوب جائے
وہ جلوؤں کی کثرت، ضیاؤں کا عالم — وہاں شمع کیا ہے، نظر جھلملائے
سنبھل داستانِ وفا کہنے والے — سمٹنے لگے ہیں چراغوں کے سائے

یہی ہے محبت کی معراج آخر
ہماری کہانی زمانہ سنائے

محبت میں ہے غم بھی اور خوشی بھی
یہیں پر دونوں راہیں مل رہی ہیں

آنسو کی کسک عشق میں ڈھلتی ہی رہے گی
یہ آگ بجھانے پہ بھی جلتی ہی رہے گی

ہزار رنگ بھری زندگی پہ ناز نہ کر
قدم سنبھل کے اٹھا موت کا اندھیرا ہے

وہ ہے بندہ جو بناتا ہے امیدوں کے محل
وہ خدا ہے جو ارادوں کو بدل دیتا ہے

دار کو جھک کے چوم لیتا ہے
موت قیدی کو کتنی پیاری ہے

اک مسافر سے کڑی دھوپ میں سوکھا ہوا پیڑ
کیا پتا ہے کہ کہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

یہ کشتی اور یہ دریا کے تیز رو دھارے
بہاؤ تیز تھا، پتوار توڑ دی کس نے

عہدِ پیری میں جوانی کا تصوّر کیا
کوئی شے رکھ کے کہیں بھول گیا ہو جیسے

آئے بھی، مسکرائے بھی، اور پھر چلے گئے
بزمِ تصوّرات کی حالت نہ پوچھیے

وہی تو ہے ترے جلووں کی آخری منزل
جہاں گمان سے گزر کر یقیں تک آئے ہیں

ٹپک کے اشک مری آستیں تک آئے ہیں
یہ آسماں کے ستارے زمیں تک آئے ہیں

جن کے الفاظ ہوں عمل کے قریب
رنگِ عالم وہی بدلتے ہیں

محبت کا بھلا ہو، اشک افشانی نہیں جاتی
ہزاروں شمعیں ہیں اور گھر کی ویرانی نہیں جاتی

ان کی ہنسی نے ضبط کے پہلو بھی کھو دیے
جو غم سے دور تھے وہی دامن بھگو دیے

روز مٹتا ہے نقشۂ عالم
روز دنیا بسائی جاتی ہے

موت امیدِ آخری ہے مگر
کیا بلانے سے آئی جاتی ہے

ازل سے آئے تو ہیں بے ثباتِ دنیا میں
مگر یہ یاد نہیں ہے کہاں کہاں ٹھہرے

کرشن بہاری نورؔ (پیدائش، ۱۹۲۴ء) فضل نقوی صاحب کے شاگردِ رشید، خوش لہجہ اور منفرد رنگ کے غزل گو ہیں جس نے اردو غزل کو خالص ہندوستانی روایات سے روشناس کروایا۔ دو مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ "تپسیا" سے چند شعر پیش ہیں جو خود نورؔ کے پسندیدہ ہیں: ؎

میں جس کے ہاتھ میں اک پھول دے کے آیا تھا
اسی کے ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے

اس انتظار میں صدیاں گزرتی جاتی ہیں
ہوس سمیٹ لے دامن تو آرزو پھیلے

اپنی اپنی خودداری کی بوسیدہ چادر تانے
چلتے رہیں گے یوں ہی ہم تم کب تک آخر آخر کب تک

ہوس نے توڑ دی برسوں کی سادھنا میری
گناہ کیا ہے یہ جانا، مگر گناہ کے بعد

بس اس کی مانگ میں سیندور بھر کے لوٹ آئے
ہمارے اگلے جنم کا چناؤ ایسا تھا

تجھ سے اگر بچھڑ بھی گیا میں، تو یاد رکھ
چہرے پہ تیرے اپنی نظر چھوڑ جاؤں گا

کوئی خیال تک بھی نہ چھوڑ پائے گا مجھے
یہ چاروں سمت آٹھوں پہر چھوڑ جاؤں گا

یوں ہی تو نہیں تجھ کو سب کہنے لگے کافر
کیا جانیے کتنوں کے ایمان گئے ہوں گے

کتنے اوتار ہوئے کتنے پیمبر آئے
تو نہ آیا ترے پیغام برابر آئے

میں تو اپنے کمرے میں تیرے دھیان میں گم تھا
گھر کے لوگ کہتے ہیں سارا گھر مہکتا تھا

زندگی ٹھوکریں کھاتی ہے بچھڑ کر تجھ سے
تیرے پازیب کے ٹوٹے ہوئے گھنگرو کی طرح

وہ پڑھتے پڑھتے مجھے سو گیا جگائے کون
کھلی پڑی ہے سرہانے کتاب مدّت سے

یہ کس خطا کی سزا میں ہیں دوہری زنجیریں
گرفت موت کی ہے، زندگی کی قید میں ہوں

تشنگی کے ہیں مقامات بھی کیا کیا یعنی
کبھی دریا نہیں کافی کبھی قطرہ ہے بہت

زندگی، پھر زندگی، پھر زندگی
کچھ نہیں، بس تہ بہ تہ تنہائیاں

بے نیاز سکھ دکھ سے رہ کے جی نہ پاؤں گا
سکھ مری تمنّا ہے، دکھ مرا مقدّر ہے

تمام جسم ہی گھایل تھا، گھاؤ ایسا تھا
کوئی نہ جان سکا، رکھ رکھاؤ ایسا تھا

یہ ہار جیت تو قسمت کے کھیل ہیں یارو
ملال یہ ہے پیادوں پٹ گئے ہیں وزیر

وہ جس کا خون تھا وہ بھی شناخت کر نہ سکا
ہتھیلیوں پہ لہو کا رچاؤ ایسا تھا

پروفیسر ولی الحق انصاری (پیدائش: ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۴ء) خاندان فرنگی محل کے فرد ہیں۔ فارسی کلام کے دو اور اردو کلام کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک نظموں پر مشتمل ہے۔ ہر صنفِ سخن میں بشمول قطعات تاریخ طبع آزمائی کی ہے۔ اشعار غزلیات کے چند نمونے پیش ہیں جن سے اندازہ ہو گا کہ طبعِ مشکل پسند رعنائیِ خیال کی طرف راغب ہے۔

حوادث کے میں ریگ زاروں میں تھا
مجھے کیا پتا کیا بہاروں میں تھا

وہ بیچارہ پیہم خساروں میں تھا
سبب یہ کہ ایسا نداروں میں تھا

پریشان رہتی تھی دنیا جہانبانوں سے پہلے بھی
جدا ہوتی رہی ہیں گردنیں شانوں سے پہلے بھی

وجودِ عشق تھا عالم میں انسانوں سے پہلے بھی
فروزاں رہتی تھی یہ شمع پروانوں سے پہلے بھی

ہمیشہ ہی حسینوں سے ہوئی ہیں پیار کی باتیں
غزل کی حکمرانی تھی غزل خوانوں سے پہلے بھی

ہر عنصرِ جاں بخش سے محروم ہوا ہے
جاتے ہو کہاں ؟ شہر کی مسموم ہوا ہے

ممکن ہے لا نہ پائے تو ٹھنڈی ہوا کی تاب
خوگر اگر ہے حبس کا، دروازے بند کر

قدم قدم پہ تھے گرداب موج موج نہنگ
کوئی بھی ایسے میں دریا کو پار کیا کرتا

صحرائے زندگی میں بلاخیز ہے ہوا
کیسے جلیں چراغ، بہت تیز ہے ہوا

کوئی تو بڑھ کے آخر اس طلسمِ شب کو توڑ دے گا
کبھی تو ہم غریبوں کی بھی دنیا میں سحر ہوگی

جو صاحبِ نظر ہیں یہ بات جانتے ہیں
دورِ خزاں میں بھی ہے رنگِ بہار باقی

یہ تیرے بازوئے شل، یہ شکستگی تیری
جو مل بھی جاتی تجھے ذوالفقار کیا کرتا

کون جیالا ہے یہ یارو بانکا ہے یہ کون
سر کٹ جانے پر بھی جس کی اکڑی گردن ہے

محبت میں کرتے ہیں جاں بھی نثار
محبت میں ہوتا ہے بیوپار بھی

یہ اہلِ قصر کہاں جائیں گے اگر اُجڑے
ہمارا کیا ہے کہیں بھی مکاں بنا لیں گے

جیسے خرمن میں گھر کے کوئی مرجان کی شاخ
یوں حسیں رخ پہ ہے تیرے دہنِ سرخ ترا

شمع خورشید ہو فانوسِ شفق میں جیسے
چمپئی رنگ پہ یہ پیرہنِ سرخ ترا

ظلمت میں شب کی ڈوبتے جانے کے باوجود
شعلے اگل رہا ہے بدستور آفتاب

جو حریفِ رسن و دار نہیں ہو سکتے
زندگی کے وہ سزاوار نہیں ہو سکتے

محلوں میں بھی جلتے ہیں دیے، کوئی بتا دو
جھونکے یہ ہواؤں کے ادھر کیوں نہیں جاتے

آسمان کے ہاتھ میں پہلے کھلونا تھے، مگر
مسئلہ اب بن گئے ہم آسمانوں کے لیے

تو نے ہلال تازہ کر دیں پرانی یادیں
اس مہروش کے ابرو خمدار ایسے ہی تھے

ہوں جیسے چودھویں شب کے چاند کی شعاعیں
اس گلبدن کی زلفوں کے تار ایسے ہی تھے

اک شاخِ گل پہ جیسے دو پھول مسکرائیں
بوٹا سے قد پہ اس کے رخسار ایسے ہی تھے

وہ آج جس کو عقیدت کے پھول ملتے ہیں
نہ جانے کتنا وہ اک پنکھڑی کو ترسا تھا

زیست کی تلخ حقیقت کو وہ سمجھے کیسے
کچھ بھی دیکھا نہ ہو جس شخص نے خوابوں کے سوا

آج تو زاغ و زغن چھائے ہوئے ہیں لیکن
کل فضا میں نہ کوئی نہ ہوگا عقابوں کے سوا

رعنائیِ خیال سے جب دور ہو گیا
دل آئینے سے شیشۂ بے نور ہو گیا

سارا زمانہ قتل میں اس کے شریک تھا
وہ شخص خودکشی پہ مجبور ہو گیا

کھویا ہوا تھا اپنے خیالات میں کوئی
دنیا سمجھ رہی تھی کہ مغرور ہو گیا

جب دل سے ڈر، دماغ سے شک دور ہو گیا
جس آئینہ سے آنکھ لڑی، چور ہو گیا

جانے بھی کیسے کوئی آگ بجھانے کے لیے
راستہ کوئی نہیں شہر میں جانے کے لیے

رسی سے ڈرنے والوں کی کوئی کمی نہیں
آجاتا ہے بہت سی زبان پہ اب بھی سانپ

چنگیز کی قبا پہ ہیں اب تک لہو کے داغ
اب تک ہے خون سے دامنِ تیمور لنگ سرخ

سرخی حیا کی دوڑ گئی دیکھ کر جسے
میں نے کیے عذاب بتِ شوخ و شنگ سرخ

پہلے ہم موم تھے اور تھے یہ صنم پتھر کے
بن گئے موم جو اب ہو گئے ہم پتھر کے

پینے لگے شراب بھی کرنے کو غم غلط
جو بات کی ولی وہ خدا کی قسم غلط

اہلِ جفا کا دستِ ستم توڑ ڈالیے
اہلِ ستم سے شکوۂ جور و ستم غلط

ہیں مرے بعد زبانوں پہ فسانے میرے
منتشر کر دیے اوراق ہوا نے میرے

کتنے ہی خضر تھے وہ دشت بلا جن کی
رہبری کی ہے نقوشِ کفِ پا نے میرے

اس زمانے کا پیمبر تو نہیں میں لیکن
کتنے ہی سانپ نگل ڈالے عصا نے میرے

کتنے ہی بگڑے ہوئے ہاتھ جذامی چہرے
پھر سے شاداب کیے دستِ شفا نے میرے

خدا کا شکر کہ شہ کی مصاحبت کے بغیر
ولی کی شہر میں اب بھی ہے آبرو باقی

ہم خاک میں ملتے یہ بھی ناپید نہ ہوں گے
دنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

ہے مری منزل وہ جس سے ہیں قدم ناآشنا
سطح جس سے بات کرتا ہوں ہے دم ناآشنا

اس نوائے آتشیں کو دے رہا ہوں شکلِ شعر
جس کی گرمی سے رہے لوح و قلم ناآشنا

ایک طوفانِ بلا بڑھتا ہوا اپنے طرف
اور ادھر فطرتی طبیعت، پاؤں رم نا آشنا

کون ہے وہ جس سے پوچھوں اپنی منزل کا پتا
برہمن نا آشنا، شیخ حرم نا آشنا

دہر ہے وہ انجمن جس میں ہے مذہب چراغ
اور بڑھے نور اگر مل کے جلیں سب چراغ

چھڑتا رہا سازِ غم انجمنِ زیست میں
جلتے رہے رات بھر خون سے لبالب چراغ

اس سال بھی پانی کو ترستے رہے دریا
اس بار بھی پگھلی نہ پہاڑوں میں جمی برف

ہم بھی ہیں عجب شخص ابھی شعلہ ابھی آگ
دل بھی ہے عجب چیز ابھی آگ ابھی برف

دنیا تمام سنگ ہے اور دل ہے آئینہ
پھر آج پتھروں کے مقابل ہے آئینہ

حکیم شارب (پیدائش: ۱۹۲۷ء) موجودہ لکھنؤ کے خوش گو اور صاحبِ فکر شاعر ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

جنگ اچھی بھی ہے بری بھی ہے
مقصدِ جنگ دیکھنا ہوگا

خاک کے پتلے اپنی قیمت کچھ تجھ کو معلوم نہیں
خاک ہے لیکن خاک کے اوپر سجدہ بھی ہو سکتا ہے

کامیاب ہو کے زمانے کو جیت لو
یا اس طرح مٹو کہ کہیں پر نشاں نہ ہو

توڑیں گے اگر لوگ تو ٹوٹیں گے وہ خود بھی
سب خاک کے پتلے ہیں، خدا کوئی نہیں ہے

زور بازو آزما، شکوہ نہ کر صیاد سے
آج تک کوئی قفس ٹوٹا نہیں فریاد سے

پرورش پائی ہے آغوش میں طوفان کی
مجھ کو آیا نہیں طوفان میں ہراساں ہونا

ہم بھی کھو جائیں گے جیسے اہلِ ماضی کھو گئے
اک زمانہ کس کی کس کی داستاں دہرائے گا

ادھر ابر بہار آیا تو ہوتا
نہ کچھ ہوتا، مگر سایہ تو ہوتا

میں دامن جھاڑ کے دنیا سے اٹھتا
مگر دنیا سے کچھ پایا تو ہوتا

ابھی اے کاروانِ عقل و دانش جرم ہے رکنا
ابھی ہم ایک ذرّے کی حقیقت بھی کہاں سمجھے

گل توڑ لیا شاخ سے یہ کہہ کے خزاں نے
یہ ایک تبسّم کا گنہگار ہوا تھا

اس دور کے انسان کو ابھی اور جگاؤ
یہ خواب سے چونکا تو ہے، بیدار نہیں ہے

بجلی کے چمکنے میں کچھ دیر لگے شاید
نظروں کے بدلنے میں تاخیر نہیں ہوتی

اپنی بھی خطاؤں سے ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں
برباد زمانے کی تقصیر نہیں ہوتی

اگر خاموش رہتا ہوں تو چپ رہنے نہیں دیتے ۔ جو کچھ کہتا ہوں میں شارب تو برہم لوگ ہوتے ہیں
توازن دیکھ کر طاقت کا دنیا سر جھکاتی ہے ۔ اُدھر کم لوگ جاتے ہیں جدھر کم لوگ ہوتے ہیں
یہ زندگی تو بہت کم ہے دوستی کے لیے ۔ کہاں سے وقت نکلتا ہے دشمنی کے لیے
سخت ہوتا ہے شعور زندگی کا امتحان ۔ انقلاب آنے سے پہلے، انقلاب آنے کے بعد
ہمارے حالِ پریشاں پہ مسکرا دینا ۔ بڑا لطیف یہ اندازِ پرسشِ غم ہے
وہ میرے پاس سے گزرے تو یہ ہوا معلوم ۔ زندگی یوں بھی دبے پاؤں گزر جاتی ہے

متذکرہ بالا شعرا کے علاوہ اس دور میں کچھ دوسرے خوش گفتار شعرا بھی ہوئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس مقالے کی تحریر کے وقت راقم الحروف کے پاس ان کے اشعار نہیں ہیں۔ ان حضرات میں بہزاد لکھنوی، سید محمد باسط، ماہر لکھنوی، افقر موہانی، محضر لکھنوی، محمد اسماعیل اسلم لکھنوی، انور نواب انور لکھنوی، مضطرب نظامی، شفق شاہانی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات بھی خالص غزل گو ہیں اور زبان کی وہ لطافت جو لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

ملّا صاحب کے چوتھے دور کے معاصر شعرا یعنی ۱۹۳۰ء کے بعد پیدا ہونے والوں میں جن کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی والی آسی، تسنیم فاروقی، بشیر فاروقی، ساحر لکھنوی، حیات وارثی لکھنوی قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور میں غزل و نظم کی وہ کش مکش جو جوش ملیح آبادی کے زمانے میں اپنے انتہائی عروج پر تھی، ختم ہو گئی اور اس میں غزل بحیثیت فاتح کے نمودار ہوئی۔ اس سے قبل کے دور کی طرح اس عہد کے بھی تقریباً تمام شعرا غزل کہنے والے ہیں اور انھوں نے اسی پیرایہ میں زندگی کے ہر مسئلہ کی ترجمانی کی ہے۔ زبان کی لطافت اس دور کے لکھنوی شعرا کا بھی طرۂ امتیاز باقی رہی اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم عصر ہندوستان بھر کے شعرا میں بحیثیت فن کار اُن کا مرتبہ کسی سے بھی کم نہیں ہے اور ان میں سے کچھ مثلاً والی آسی، تسنیم فاروقی اب بہ مرتبۂ استادی فائز ہیں اور اپنے بزرگوں یعنی عبد الباری آسی اور سراج لکھنوی کے نام روشن کر رہے ہیں۔

ملّا صاحب کے عہد کی شاعری کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا گیا جس کے سلسلے میں

اس دور کے شعرا کے کلام کو پیش کرنا ضروری تھا۔ اس جائزہ سے پتا چلے گا کہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں لکھنوی شاعری اپنا مقام بنائے رکھی۔ غزل کے میدان میں اگر صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ، آرزوؔ، اثرؔ، منظرؔ، سالکؔ، سراجؔ، سیّد نواب افسرؔ، عمر انصاری، نور لکھنوی، ڈاکٹر ولی الحق کا کلام ہندوستان کے کسی بھی معاصر سے بیان و زبان کے سلسلے میں کم نہیں ہے تو نظم کے میدان میں صفیؔ، عزیزؔ، جوشؔ، عمر انصاری، اسرارالحق مجازؔ، ڈاکٹر ولی الحق انصاری اپنے معاصر نظم گویوں میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ ملّا صاحب ان تمام حضرات کے معاصر رہے ہیں اور ان کے ان تمام معاصرین کے رنگ کلام کی خصوصیات ملّا صاحب کے کلام میں بیک وقت نظر آتی ہیں اور بحیثیت مجموعی ملّا صاحب نے اپنے لیے ایک الگ راستہ پیدا کر دیا ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

ملّا ادب میں ڈھونڈھ لی جادہ سے ہٹ کے اپنی راہ
رنگ جدید سے الگ طرز کہن سے دور دور

ملّا صاحب کا یہ "رنگ جدید سے الگ اور طرز کہن سے دور" رنگ کلام ان کی غزلیات اور نظموں دونوں میں نمایاں ہے۔ اس رنگ میں کلاسیکی ٹھہراؤ بھی ہے اور جدید مسائل پر اظہارِ خیال بھی۔ ملّا صاحب کی زبان بہر حال لکھنوی زبان ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار بھی بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں: ؎

نعرۂ گرم انقلاب میں نے بھی یاں سنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دور دور

دی ہے مجھے دوا بہ لُگنگ و جمن نے جو زباں
آج اسی کو حکم ہے گنگ و جمن سے دور دور

نہ تیرے لیے ہے نہ میرے لیے ہے
یہ دنیا ہے سب کی، سب کے لیے ہے

ہر سبزہ و گل کی نس نس میں اک ریشۂ جنباں ہو بھی چکا
اب کون مٹا سکتا ہے مجھے میں خاک گلستاں ہو بھی چکا

جور بتاں کے قصّے نہ چھیڑو
آج اک جہان ہے مردم گزیدہ

بے حرف و بے صوت پیغامِ الفت
سینہ بہ سینہ، دیدہ، نہ دیدہ

جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے
ادھر بھی ہوش کے دشمن ادھر بھی دیوانے

پھر ان گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے
انھیں پہلے ذرا زیرِ فلک کچھ روز رہنے دے

قطرہ قطرہ زندگی کے زہر کا پینا ہے غم
اور خوشی ہے دو گھڑی پی کو بہک جانے کا نام

تاریخ بشر بس اتنی ہے ہر دور میں پوجے اس نے صنم
جب آئے نئے بُت پیش نظر اصنام پُرانے توڑ دیے

گل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی
گلچیں کی عدالت ہے تو کانٹوں کی گواہی

پستی نہ بلندی نہ اطاعت نہ حکومت
دنیائے محبّت میں گدائی ہے نہ شاہی

مشعلِ دل بھی تو سینے میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہگذر کافی نہیں

زیست کی تیرگی میں شمع کوئی
دل سے تابندہ تر نہیں ملتی

بشر ہے بندہ الفت غلام جبر نہیں
جو اہلِ دل نے کیا، تاجدار کر نہ سکے

اسی کا نام جینا ہے جگر خون ہو تو ہو جائے
نقوشِ دہر میں اک خاص اپنا رنگ بھرنا ہے

پیتے تو ہم نے شیخ کو دیکھا نہیں مگر
نکلا جو میکدے سے تو چہرے پہ نور تھا

تشنہ کاموں کی خبر لے مالکِ جام و سبو
تشنہ کامی نہ بن جائے جیرہ دستی ایک دن

فلک کے دور نے ذرّوں کا جن کو نام دیا
ستارے وہ بھی تھے، یاں نسل آسماں سے نہ تھے

بحیثیت نظم گو ملّا صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے پابند اور آزاد، دونوں قسم کی نظمیں کہیں جن میں چند مشہور یہ ہیں: اندھیرے نگر میں دیپ جلیں، بوڑھا ماجھی، ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے۔

کلامِ ملّا پر تبصرہ کرنا احاطۂ مضمون سے باہر ہے اور امید ہے کہ کوئی دوسرا ناقد اس پر تفصیلی روشنی ڈالے گا۔

جبّار علی رضوان انصاری

مُلّا صاحب کی شاعری پر ایک نظر

جس دور میں عزیز، صفی اور ثاقب لکھنوی کی شاعری کا لکھنؤ میں سکہ رائج تھا، اسی عہد میں آنند نرائن ملّا نے شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کے لیے قدم رکھا۔ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری سے پانچویں دہائی لکھنؤ شعروسخن کا دورِ عروج رہا ہے۔ ہر گلی و کوچے میں شعروشاعری کا چرچا تھا۔ ہر اہلِ علم کا کاشانہ شعروسخن کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طرحی و غیر طرحی مشاعرے تقریباً ہر روز کسی نہ کسی محلّہ میں کسی انجمن کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے رہتے۔ بزمِ سخن کی انجمنیں گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مصروف تھیں۔ ہر شعروادب کی محفل میں عزیز لکھنوی کی غزل کا یہ شعر ذکروفکر کا موضوع بنا ہوا تھا ؎

اپنی مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا

ان ہی شعری فضاؤں میں ملّا صاحب نے اپنی خداداد صلاحیت سے شعروسخن کو جِلا دی اور شاعری کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اس عہد میں لکھنوی شاعری دو زاویہ ہائے ادب پر چل رہی تھی۔ پہلی لکھنوی فضا سے متاثر، جس میں غزل گوئی کا اثر غالب تھا۔ دوسری سیاسی اور حبِّ وطن پر مبنی نظم گوئی۔ ملّا صاحب نے ان دونوں زاویہ ہائے نظر کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ نظم گوئی پر انھوں نے خصوصیت سے توجّہ دی۔ لیکن غزلیں بھی کہیں اور خوب

کہیں ہاں یہ غزلیں بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کی بہترین مثال ہیں۔

اردو شاعری میں ملّا صاحب کی شخصیت ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ان کی شاعری کی عمر خاصی طویل ہے۔ انھوں نے اس طویل عرصہ میں بہت اچھی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ چناں چہ آج ان کا شمار اردو شعرا کے صفِ اوّل میں کیا جاتا ہے۔ ملّا صاحب نے نظم، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ اور جدید نظم وغیرہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر نظموں اور غزلوں میں ہی ان کے جوہر کھلے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں چکبستؔ اور اقبالؔ کی ہم پایہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

جس زمانے میں ملّا صاحب نے طبع آزمائی شروع کی، اس وقت چکبستؔ کی قومی نظمیں فضا میں گونج رہی تھیں اور لکھنوی شاعری کو ایک نیا زاویۂ فکر عطا کر رہی تھیں، جس سے ملّا صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی شاعری کے ابتدائی حصّے میں چکبستؔ کے ساتھ ساتھ سرورؔ جہان آبادی کی شاعری کا اثر بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ ملّا صاحب کی وطنی و سیاسی شاعری میں انھیں دونوں شاعروں کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان دونوں شعرا کے علاوہ ملّا صاحب نے غالبؔ اور اقبالؔ کے فلسفے اور علوئے تخیل سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان دونوں عظیم شعرا کے افکار کی جھلکیاں ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔

ملّا صاحب کی شاعری کا وطن پرستی اور حبِّ وطنی کے بعد جو سب سے زیادہ اہم موضوع ہے وہ انسان دوستی ہے۔ ان کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے انسان کی شاعری ہے جو اپنے سینے میں ایک درد آشنا دل رکھتا ہے اور وہ بقول امیرؔ مینائی: ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کا مجسّم پیکر بن گئی تھی۔ اردو شعر و سخن کے تقریباً ہر شاعر نے انسان دوستی کی باتیں کی ہیں مگر جس انداز سے ملّا صاحب کے کلام میں یہ عنصر ملتا ہے۔ وہ غالبؔ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں خال خال نظر آئے گا۔

ملّا صاحب کا انگریزی ادب کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور اس مطالعہ نے ملّا صاحب کو غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری پر متوجّہ ہونے کے لیے مجبور کر دیا جس کے نتیجہ میں انھوں نے

اشعارِ غالبؔ کو انگریزی پیکر پہنانے کی کوشش کی۔ ملّا صاحب کا مسلک غالبؔ کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ غالبؔ نے انسان دوستی کا نظریہ پیش کرنے کی طرف توجہ کی اور یہ نظریہ غالبؔ کے یہاں فکر اور عقیدے کی بنیاد بن کر آیا۔ غالبؔ نے ببانگِ دہل اعلان کردیا کہ ع

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

اور اس قوم پر اپنے فعل کو ہمیشہ صادق کر دکھایا۔ ملّا صاحب کی شاعری بھی انسان دوستی پر مبنی ہے۔ انھوں نے بھی دنیاوی عیش و عشرت کی خاطر اپنے ذہن و فکر اور قول و فعل کا سودا نہیں کیا۔ فرقہ پرستی کے باد تند میں بھی انھوں نے شمعِ انسانیت روشن رکھا۔ چنانچہ اپنے دل کی باتوں کو شعر کا جامہ پہناتے ہوئے کہا: ؎

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

بنی نوعِ انسان کے درد و تکلیف کے احساس کا موثر انداز اظہار ملّا صاحب کی آواز کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ اس رنگ میں ان کے بہت کم حریف ملیں گے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین صاحب رقم طراز ہیں:

"ان کے (ملا صاحب) صاف شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصوّر سے خون ہو جانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔"

[مختصر تاریخ ادب اردو]

ملّا صاحب کی بنی نوعِ آدم اور انسان دوستی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر سیّد اعجاز حسین کی رائے ملاحظہ ہو:

"ملاّ کی شاعری میں حبِّ وطن، انسان دوستی اور نئی دنیا کے محور ملتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر۔"

[تاریخ ادب اردو ص ۲۱۵-۲۱۴]

ملاّ صاحب کے انسان دوستی پر مبنی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی   دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں   ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمع راہِ زندگی   کیا بشر کے واسطے حبِّ بشر کافی نہیں

معبدِ انساں بنے، کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے   اس کی پیشانی پہ ہو، میرے ہی بُت خانے کا نام

اب آگے تری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہ بشر   میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے

ملاّ صاحب کو غزل کے اسرار و رموز سے مکمل آگاہی ہے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ لکھنؤ کی گلی و کوچوں میں گزارا اور لکھنوی دبستانِ شاعری بالخصوص غزل گو شعرا کے ماحول میں رہے۔ مگر یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی کسی لکھنوی غزل گو شاعر سے متاثر نہیں ہوئے۔ غزل گوئی میں غالبؔ کا اثر ضرور قبول کیا ہے۔ ملاّ صاحب کی غزلیہ شاعری پر پروفیسر اعجاز حسین صاحب کی ناقدانہ رائے ملاحظہ ہو:

"ملاّ کی غزلوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے۔ ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ اظہارِ عشق کرتے ہیں اور امتیازی پہلو ان کی غزلوں

کا یہ ہے کہ معنویت سے لہجہ کا ابھار اتنا ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ اسی اندازِ بیان کا اثر یہ ہے کہ سپردگی و ربودگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ بجائے عشق میں کھو جانے کے وہ عشق کے وقار و آداب کو غزلوں میں پیش کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان کی غزلوں میں تازگی اور تڑپ ضرور ہے۔"

[مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۲۱۵]

ان کی غزلیہ شاعری پر عظیم الحق جنیدی ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان کی غزلوں میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ ان کے اظہارِ عشق میں بھی ایک خاص قسم کا وقار ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کی معنویت اور طرزِ ادا کی متانت دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔"

[اردو ادب کی تاریخ، ص ۱۵۶]

ملّا صاحب کی غزلوں میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی ہے۔ وہ عشق کی رندی و سرمستی اور حسن کی رعنائی کے قائل ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک بہت بڑا حصّہ ان ہی جذبات و کیفیات کی ترجمان ہے۔ لیکن ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ان جذبات و کیفیات میں صرف رومانیت کا رنگ پیدا نہیں کیا بلکہ ان کو وہ حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ کیفیات و جذبات ایک مخصوص سماجی پس منظر میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی پر ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

"غزل ملّا کے ہاتھ میں رنگارنگی اور بوقلمونی کا ایک گلدستہ ہے۔ انھوں نے غزل کو وسعت دی ہے .... ان کی غزلوں کا موضوع صرف حسن و عشق نہیں بلکہ انھوں نے غزل کے دامن میں زندگی کے دوسرے موضوعات کو بھی سمویا ہے۔ حالؔی کے وقت سے لے کر غزل کو وسعت دینے کی جو روایت قائم ہوئی تھی اور جس کو چکبستؔ اور اقبالؔ نے ایک مستقل رجحان بنا دیا تھا، اس کو ملّا صاحب نے شعوری

طور پر اپنایا ہے۔ غزلوں میں انھوں نے اقبال اور چکبست کی طرح
زندگی کے ٹھوس اور اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔"

[جدید شاعری ص ۳۱۸]

ملّا صاحب کی غزلوں میں مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کا شعور بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں حسرت کے غزل کی رنگینی و رعنائی، چکبست کا فلسفیانہ تفکّر، اقبال کی معنویت و گہرائی سبھی مل جاتے ہیں۔ ان جملہ اثرات کو ملّا نے اپنی انفرادیت کے سانچے میں ڈھال لی ہے، جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان کا عشق سہانے خوابوں کی خیالی دنیا سے ماورا ہے۔ صرف وقتی کیفیت کے زیرِ سایہ پیدا ہونے والی سستی جذباتیت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ ایک بڑا سنجیدہ عشق ہے، ایک باشعور اور دانش مند انسان کا عشق ہے۔ ایک ایسے فرد کا عشق ہے، جو صرف موجوں کے دھاروں پر بہتا ہی نہیں سوچتا بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں جگر مرادآبادی کے تغزل کی سی سرمستی و رندی نہیں ملے گی۔ بلکہ سماجی شعور رکھنے والے دوسرے جدید شعرا کی طرح حقیقت اور رومان کا حسین سنگم ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ملّا صاحب کے یہاں تغزل کی اچھی مثالیں نہیں ہیں۔ ایسا بھی نہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

ساتھ تیرے زندگی کا وہ تصوّر میں سفر
جیسے پھولوں پہ قدم رکھتا چلا جاتا ہوں میں

آج اک غرورِ حسن بھی شامل ہے حسن میں
شاید کسی نگاہ کا کچھ بھید پا گئے

وہ عجب گھڑی تھی نظر میں مری جب تجھ سے ملی تھی
مگر اک دم کو جیسے کہ ٹھہر گیا زمانہ

مری زیرِ لب حقیقت کی اسے خبر نہ ہوتی
وہ تو یہ کہو کہ دنیا نے بنا دیا فسانہ

مرے دل کی خود یہ مجال تھی کہ وہ شامِ غم کو سحر کرے
تری یاد آکے گھڑی گھڑی اگر آنسوؤں کو ہنسا نہ دے

شبِ غم میں بھی اے تصوّرِ دوست ۔۔۔ زندگی کا مزہ دیا تو نے

آنکھوں میں اک نمی سی ہے ماضی کی یادگار ۔۔۔ گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

عہدِ شوخی کسی کا ختم ہوا ۔۔۔ نگہِ شرمسار کے دن ہیں

کبھی مُلّا سے روٹھ کر سوچا ۔۔۔ اس کے دل میں بھی ہیں گلے کیا کیا

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمھیں بھلا سکے ۔۔۔ کوئی کمی ہمیں میں تھی، یاد تمھیں نہ آ سکے

نہیں میں پیار کے قابل، تو مجھ کو پیار نہ کر ۔۔۔ مگر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر

آئے ہو کیا تمہی، مجھے آواز دو ذرا ۔۔۔ آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

تیور چڑھا کے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ ۔۔۔ پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

مجھے کر کے چپ کوئی کہتا ہے ہنس کر ۔۔۔ انھیں بات کرنے کی عادت نہیں ہے

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش ۔۔۔ کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

اک سلام، اک مسکراہٹ، اک سوال، اک شکریہ ۔۔۔ وہ بھی یوں ہی راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے

مدعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ ۔۔۔ میرے ہونٹوں تک سوالِ ناتمام آیا تو کیا

چھیڑتے ہو کیوں مجھے، کیوں پوچھتے ہو حالِ دل　　کیا مرے رنگِ تبسّم سے نمایاں کچھ نہیں

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں　　یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

ملاّ صاحب کی ان غزلوں میں تغزّل کی مکمل خوبیاں موجود ہیں۔ ان اشعار میں ایک مہذّب عشق ہے۔ یہ تغزل ایک ایسے انسان کا ہے، جس کی جوانی دیوانی نہیں ہے۔ رندی و سرستی نہیں۔ ہاں شائستگی ضرور ہے۔

ملاّ صاحب پر مذہب نے کوئی اثر مرتّب نہیں کیا، بلکہ کہیں کہیں انھوں نے مذہب کی اعلانیہ بغاوت کی ہے۔ درحقیقت ملاّ صاحب نے اپنے مذہب کا نام "انسانیت" دیا ہے۔ وہ انسان کو ترقّی کی شاہراہوں پر گامزن دیکھنے کے متلاشی ہیں۔ ان کا ایمان ارتقا کے نظریہ پر ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انھیں موضوعات کو جگہ دی ہے چنانچہ اس موضوع پر چند اشعار مزید پیش ہیں :ے

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن　　فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

محبّت آج بھی ہے حاصلِ حیاتِ بشر　　حقیقت ابدی انقلاب کیا جانے

بشر کو ابھی تاب الفت نہیں ہے　　بشر میں ابھی آدمیت نہیں ہے

حیات اک سازِ بے صدا تھی سرودِ عمرِ رواں سے پہلے　　بشر کی تقدیر سو رہی تھی خطائے باغِ جناں سے پہلے

یہ وہ اشعار ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ آغازِ مقالہ میں ملاّ صاحب کی نظم گوئی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اجمالاً اس موضوع پر بھی روشنی ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

ملاّ صاحب نے اپنی نظموں میں معاشرتی اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

ان کی نظموں میں عشقیہ واردات وکیفیات کی ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔ اور حسن پرستی کا احساس بھی موجود ہے۔ عوامی زندگی کا شعور بھی ہے۔ غرض کہ بہ لحاظ موضوعات ان کی شاعری کا میدان بہت وسیع ہے۔ ان موضوعات پر ان کی متعدّد نظمیں "جادۂ ملّا" اور "جوئے شیر" میں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں ایک جدّت ہے اور سادگی و پُرکاری بھی ہے، موسیقی و غنائیت بھی موجود ہے۔ واقعیت اور حقیقت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی تمام نظمیں شعریت کے جملہ لوازم سے بھرپور ہیں۔ ان کی ایک شاہکار نظم "جوئے شیر" میں "ٹھنڈی کافی" ہے۔ فنّی نقطۂ نظر سے یہ نظم اردو شاعری میں اہم مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس نظم کے بارے میں عصرِ حاضر کے عظیم ناقد پر پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے نظریات رقم طراز ہیں:

"اس نظم میں محبّت کی فضا ملتی ہے، جو اس دنیا کے ہوتے ہوئے بھی آسمانوں کے ہمراز ہیں۔ اس کا فطری بہاؤ اور ارتقا اس کی موزوں اور متناسب تصویریں، اس کے نفسیاتی لمحے اور شوخ اشارے اسے کامیاب محبّت کا ایک دل کش ڈراما بنا دیتے ہیں۔ اس نظم کی فضا میں دو کردار ابھرتے ہیں اور دونوں جادو کے کرشمے نہیں، اسی دنیا کے انسان ہیں، جو مل بیٹھتے ہیں تو دنیا کچھ اور حسین اور گوارا ہو جاتی ہے، جو ذہنی پرچھائیاں نہیں گوشت پوست کے انسان ہیں، یہ نظم جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔"

مقالہ کی طوالت کے خوف سے بلا تنقید و تبصرہ ملّا کی دو[2] شاہکار نظموں "ٹھنڈی کافی" اور "گمراہ مسافر" سے چند اشعار قارئین کے نذر کیا جا رہا ہے ـــــ ملاحظہ ہوں ؎

بند بازار تھے سڑکوں پہ تھی بجلی کی قطار
تھک کے سوئی تھی دلہن شہر کی پہنے ہوئے ہار

دھندلے دھندلے سے مکانات کہ سینے کی ابھار
ہلکی ہلکی سی ہوا سانس کی جیسے للکار

عصمتِ شہر پہ جادو سی پڑی رات کی تھی

وقت کی بات تھی یا سوزِ جگر کی تاثیر
وہ بھی کرنے لگی کھولی ہوئی سی تقریر

کھنچ گئی جیسے یکایک کوئی سینوں پہ لکیر   گو ابھی لب پہ نہ تھی جذبۂ دل کی تعبیر
ایک دنیا مگر آنکھوں میں اشارات کی تھی

نگہ گرم تمنّا کی وہ شعلہ اثری   اک سلگتا ہوا پارہ تھا کہ خونِ جگری
اک لرزتے ہوئے آنچل کی وہ زیر و زبری   شرم کی آخری مفلوج سی سینہ سپری
مشتعل آگ سی بھڑکے ہوئے جذبات کی تھی

اپنے معراجِ ترنّم پہ تھا سازِ فطرت   ایک نغمہ تھا تکلّم تو خموشی اک گت
چشم و لب کوثر و تسنیم تو بازو جنّت   سادہ سی سادہ ہر اک بات میں بھی اس ساعت
ایک رنگینیِ پُر کیف محاکات کی تھی

(ٹھنڈی کافی)

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا   اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا
اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر   دیوار پس دیوار ملی، دیوار میں دروازہ نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے   اک لکڑی تو اندھے کو ملی، آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
جرّاحِ خرد آتا بھی رہا صد مرہمِ اکسیری لے کر   جو زیست کے زخموں کو بھر دے ایسا کوئی پھاہا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیے   جس میں اک تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعہ نہ ملا
دولت کا مغنّی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر   ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آکر پھر دل سے نکالی کچھ پھانسیں   لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیمِ مساوی کے حامی پھر لے کے بڑھے میزاں اپنا   جو سب کو میزاں تول کے دے میزاں میں وہ پلّا نہ ملا
بے چاری الفت کے مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی   لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
اور پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہِ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

(گمراہ مسافر)

ملّا صاحب کے کلام میں یہ نظم منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ "ٹھنڈی کافی" میں پیش کردہ تصویریں زندگی سے مکمّل طور سے بھرپور ہیں۔ رعنائی، رنگا رنگی، آہنگ و ترنّم، بانکپن وغیرہ کے

حسین امتزاج نے نظم کو حسن و موسیقی کا ایک لاثانی پیکر بنا دیا ہے۔

اردو اصنافِ شعری میں ملّا صاحب کی آواز ایک منفرد آواز ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم "ان کی آواز ماضی کی صدائے باز گشت، حال کا رزمیہ اور مستقبل کا نقیب ہے"۔ ملا صاحب کو انسانی زندگی بہت عزیز ہے ان کو زندگی کا بڑا گہرا شعور بھی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں زندگی اپنی پوری رنگا رنگی اور تنوّع کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ملّا صاحب کو غزل اور نظم دونوں پر قدرتِ تامّہ حاصل ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کو اپنی شاعری سے بہت کچھ دیا ہے۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ اصنافِ شعری کا اپنا اثاثہ پیش کر کے دامنِ اردو کو مالا مال کیا ہے۔ اگر ملّا صاحب شاعری نہ بھی کرتے تو ان کا یہ قول کہ: "اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب بدل سکتا ہوں، مادری زبان نہیں"۔ حیاتِ دوام کے لیے کافی ہے۔ (اقتباس خطبۂ صدارت انجمن ترقی اردو، نئی دہلی)

اردو کی زبوں حالی پر ملّا صاحب بہت کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ اس کو جائز حق نہ ملنے پر اپنے دلی جذبات کا اظہار یوں فرماتے ہیں: ؎

اک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں ۔۔۔ پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو ۔۔۔ اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

آج اردو کو ایسے ہی عظیم فن کار، یقیں محکم، عمل پیہم مجاہد کی ضرورت ہے جو زبان و قلم دونوں سے بیک وقت خدمت میں مصروف ہو۔ اردو ملّا صاحب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

******

ڈاکٹر آصفہ زمانی

مُلّا کی "بیسوا" ـــ ایک تجزیاتی مُطالعہ

عورت قدرت کا ایک حسین شاہکار ہے۔ ڈاکٹر ہیگو نے اپنے ایک شاہکار میں قدرت کے اس حسین پیکر کے متعلق نثر میں یوں شاعری کی ہے:

"...... پھر خدا نے عورت کو بنانا چاہا۔ اُس نے سوچا کہ گُندھی ہوئی مٹی تو ختم ہو چکی ہے...... اس لیے عورت کو سب سے اہم کیوں نہ بنا دوں۔ یہ خیال آتے ہی خدا نے چاند سے اس کی چمک لی، سمندر سے اُس کی گہرائی لی، موجوں سے گرمی، شبنم سے اُس کی مسرور کُن تراوت، سیماب سے بے قراری، چھوئی موئی سے نزاکت، گلاب سے رنگت اور دل کشی، شراب سے خمار، شہد سے حلاوت، سونے سے اس کی بھڑک، ہیرے سے اس کی سختی..... نیل گائے سے آنکھوں کا جادو، خرگوش سے شرم، قمری سے نغمہ..... پھر اس نے ایک مجسمہ تیار کر کے اس کا نام "عورت" رکھا۔ فرشتوں نے پوچھا اے خالقِ ارض وسما! تو نے اپنے پاس سے اس وجود میں کیا چیز شامل کی۔ خدا نے جواب دیا "محبّت"۔ اس پر فرشتے سر بہ سجود ہو گئے پھر عورت کو مرد کی دل بستگی کے لیے اس کے حوالے کر دیا۔"

(محمد برکت اللہ۔ صنفِ نازک ہمایوں، ۱۰ اپریل ۱۹۳۳ء، ص ۲۸۵)

قدرت کے اس حسین شاہکار کے کئی روپ ہیں۔ وہ صرف ایک حسین و نازک محبوبہ ہی نہیں مادر مہربان کی شکل میں ممتا سے چھلکتا ساگر بھی ہے اور ہمشیرہ کے روپ میں محبّت کا گاگر بھی۔ وہ ایک شوہر پرست اور وفاشعار بیوی بھی ہے اور ایک اطاعت گزار اور فرماں بردار بیٹی بھی۔ سماج کی ستم ظریفی نے اسے ایک اور خطاب سے نوازا ہے جسے ہم اور آپ "طوائف" کہتے ہیں۔

اردو فکشن میں سماج کی دیگر اچھائیوں اور برائیوں کے ضمن میں سماج کے اس ناسور کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا اور طرح طرح سے اس کی تحلیل نفسی کی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا "فسانۂ مبتلا" اردو کا وہ پہلا ناول ہے جس میں طوائف کے کردار کو بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ طوائف کے مسئلے پر باقاعدہ لکھے جانے والے ناولوں میں قاری سرفراز حسین کا "شاہدِ رعنا" مرزا رسوا کا "امراؤ جان ادا" منشی پریم چند کا "بازارِ حسن" اور قاضی عبدالغفار کا "لیلیٰ کے خطوط" قابلِ ذکر ہیں۔

شعر میں بھی اس موضوع کو اچھوتا نہیں چھوڑا گیا۔ مختلف شعرائے اردو ادب نے مختلف ادوار میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ عصرِ حاضر میں پنڈت آنند نرائن ملّا نے بھی اسے اپنی نظم کا موضوع بنایا۔

پنڈت آنند نرائن ملّا عصرِ حاضر کے وہ ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے غزل و نظم دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں کی بہ نسبت ان کی نظمیں زیادہ پُرزور ہیں۔ شاید اس لیے کہ نظم ایک بیانیہ صنف ہے اور ان کا بیانیہ زیادہ قوی ہے۔

یوں تو انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف سیاسی و سماجی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کی نظموں کا نمایاں وصف واحد متکلم میں عورت کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ان کی نظم "دوشیزہ کا راز"، "سماج کا شکار"، "آخری سلام" اور "بیسوا" ایسی ہی نظمیں ہیں جہاں عورت کے دلی جذبات و کیفیات کو انھوں نے بڑے نفسیاتی طریقے پر قلم بند کیا ہے۔ چونکہ اس وقت ہمارا روئے سخن ان کی نظم "بیسوا" کی طرف ہے اس لیے ہم مختصراً اسی پر اظہارِ خیال کریں گے۔

ملاّ کی "بیسوا" مسدس کی شکل میں تیرہ بند کی نظم ہے۔ یہ طوائف کی زخمی روح کا وہ نوحہ ہے جسے پڑھ کر انسانیت کی آنکھیں اشکبار ہو اٹھتی ہیں۔ طوائف جو ہمیشہ سے سماج کا ایک ناسور سمجھی گئی، اس کی روح میں جھانک کر دیکھنے کی کتنوں نے ہمّت کی، ملاحظہ کیجیے اس کی اس پرسش میں کس قدر درد و کرب پوشیدہ ہے ؎

سچ کہو تم نے کبھی اس بات کی پرسش بھی کی　　قصّۂ غم مرا سننے کی کبھی خواہش بھی کی؟
چشمِ رحمت میں مرے عیبوں کی گنجائش بھی کی؟　　میرا دردِ دل سمجھنے کی کبھی کوشش بھی کی؟
قابلِ نفریں ہمیشہ مجھ کو سمجھا ہی کیے
مجھ پہ انگشت حقارت تم اٹھایا ہی کیے[1]

اردو ادب میں میر انیس سے بڑھ کر فرقِ مراتب کے لحاظ سے جذبات کی ترجمانی کسی دوسرے شاعر نے شاید ہی کی ہو۔ ملاّ کو اس امتیاز کا درک خوب ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم "دوشیزہ کا راز" کے ایک بند میں کمسن دوشیزہ کے اس ہیجانی کیفیت کو قلم بند کیا ہے جب وہ شباب کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتی ہے۔ وہ بند اس طرح ہے ؎

تازگی بادِ صبا میں کل تلک ایسی نہ تھی　　آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے، ارماں میں یہ گرمی نہ تھی　　ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی
اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں؟
آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں؟

اب اسی کے مدِّ مقابل "بیسوا" کا یہ بند ملاحظہ کیجیے۔ بیسوا جب شباب کی منزل میں پہلا قدم رکھتی ہے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ دونوں دوشیزائیں شباب سے پہلی بار آشنا ہو رہی ہیں۔ آشنائی کا یہ باریک فرق ملاحظہ ہو ؎

---

[1] میری حدیث عمر گریزاں از ملاّ، انڈین پریس، الہ آباد، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۰
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۲۲

جب مُرادوں پر ذرا میرا شباب آنے لگا　　اک ذرا نظروں میں میری جب حجاب آنے لگا
کچھ سمجھ میں جب تمنّا کا حساب آنے لگا　　جاگتی آنکھوں میں اک الفت کا خواب آنے لگا
مجمعِ عشّاق میں سرگوشیاں ہونے لگیں
کُھل گیا نیلام میرا، بولیاں ہونے لگیں[۱]

ملّا نے ایک جگہ پردہ نشیں گھریلو عورت سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ محبت کے سودے میں دونوں گھاٹے میں ہیں۔ اس لیے کہ دونوں مرد کی سیمابی سرشت سے دوچار ہیں جس کے نتیجے میں طوائف تو آبرو کھوتی ہے اور گھریلو عورت تو آزادی بھی کھو دیتی ہے ؎

مجھ سے اے پردہ نشیں حالت تری بہتر نہیں　　گھر میں رہ کر بھی ترا مردوں کے دل میں گھر نہیں
آشنا پرواز کی لذّت سے تیرے پَر نہیں　　مے سے پُر ہو کر بھی گردش میں ترا ساغر نہیں
آبرو میں نے تو کھوئی آب و دانے کے لیے
تو نے آزادی بھی کھو دی آشیانے کے لیے[۲]

ایثار و قربانی کا دوسرا نام عورت ہے۔ وہ خواہ جس روپ میں بھی ہو۔ ایثار اس کی سرشت کا ایک جُز ہے۔ عورت کی اسی خصوصیت نے سماج کی اس ناپسندیدہ ہستی کو بھی کردار کی بلندیاں عطا کی ہیں ؎

اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو مٹانا مجھ سے سیکھ　　ہنستے ہنستے آگ دامن میں لگانا مجھ سے سیکھ
سوزِ خاطر کو زمانے سے چھپانا مجھ سے سیکھ　　سیکڑوں غم لے کے دل میں مسکرانا مجھ سے سیکھ
زندگی اپنی مجھے گو اک نظر بھاتی نہیں
میری پیشانی پہ بھولے سے شکن آتی نہیں[۳]

۱؎ میری حدیث عمر گریزاں از ملّا، انڈین پریس، الٰہ آباد، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۲
۲؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۳۳
۳؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

نظم کے آخر میں ملّا نے "شمعِ محفل" اور "چراغ خانہ" کی اصطلاحات میں "تجلیِ نور" کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ اس نظم کی معراج ہے ؎

اس کی درگاہِ کرم پر ایک سائل میں بھی ہوں   گو کہ ہوں جام شکستہ، زیبِ محفل میں بھی ہوں
اپنے ساقی کی نظر میں ظرفِ قابل میں بھی ہوں   دردسے واقف ہوں میں بھی، صاحبِ دل میں بھی ہوں

مجھ میں اور تجھ میں تجلّی ہے وہی دستور ایک
شمعِ محفل اور چراغ خانہ میں ہے نور ایک[1]

---

[1] میری حدیث عمر گریزاں، ص ۳۳

ایم۔ حبیب خاں

پنڈت آنند نرائن مُلّاؔ۔ ایک قد آور شخصیت

پنڈت آنند نرائن ملاّ اردو کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ میں ایک مدّت سے ان کی شعری اور نثری تخلیقات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ بیسیوں بار ملاقات کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ والد کا نام پنڈت جگت نرائن ملا تھا جو لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے اور آخر میں ترقی کر کے جج کے اعلا منصب تک پہنچے۔ پنڈت آنند نرائن ملاّ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۵ برس کی عمر میں بسم اللہ مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی نے اردو سے کرائی اور انھیں سے اردو اور فارسی پڑھی۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور وہیں سے قانون کا امتحان پاس کیا۔ وکیل بنے اور ترقی کر کے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبالؔ، غالبؔ، انیسؔ اور چکبستؔ سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ اقبالؔ اور غالبؔ کے بعض اشعار کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

ملاّ صاحب کشمیری پنڈت ہیں۔ ان کی شخصیت کی شناخت ان کی جاگیردارانہ شائستگی ہے۔ بقول ملاّ صاحب غزل ایک ریاکار صنف ہے۔ اُنھوں نے نظمیں کم، غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ "میری حدیث عمر گریزاں"، "جوئے شیر"، "کچھ ذرّے کچھ تارے" اور "جادۂ مُلاّ" ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کی زبان میں بہت سی متنازعہ باتیں صاف

صاف بیان کردی ہیں۔ "جوئے شیر" ملّا صاحب کا تیسرا شعری مجموعۂ کلام ہے۔ اس کا دیباچہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا تھا۔ پروفیسر سرور نے دیباچے میں ملّا صاحب کی شاعری کو نئے لکھنؤ کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی شاعری ایک انسان دوست کی شاعری ہے۔ امیر مینائی کا یہ شعر ان کی دردمند شاعری کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ملّا صاحب کے یہاں یہ درد ان کی شاعری میں مختلف نظموں اور غزلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ملّا صاحب کی غزل کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترے نرم لہجے کو للکار دے دی
ترے دستِ نازک میں تلوار دے دی
دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو

اردو زبان سے ان کی بے پناہ محبّت ان کے خلوص اور گہری عقیدت کا وہ اظہار ہے جس نے جے پور اردو کانفرنس کے خطبے میں صاف صاف کہہ دیا کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں، مادری زبان نہیں"۔ ملّا صاحب کی مادری زبان اردو ہے۔ اس کی بقا اور حفاظت کے لیے حاکمِ وقت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے بھی حکومت سے اس لیے برابر لڑتے رہے کہ اردو اس ملک کی زبان ہے۔ اور ہماری تہذیب اور کلچر کا سارا سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ اردو لکھنا پڑھنا ہر انسان کا آئینی حق ہے اور اس پر ان کی ہمیشہ نظر رہتی ہے۔

۱۹۳۸ء میں ملّا صاحب نے نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کی نثر نگاری کی ابتدا ایک ریڈیائی ٹاک "غالب کے کلام میں تصوّف" سے ہوئی۔ اس کے محرک علّامہ نیاز فتحپوری تھے۔ بقول ملّا صاحب انھوں نے تین سو کے قریب ریڈیائی ٹاکس لکھیں لیکن زیادہ تر ضائع ہوگئیں۔ جو کچھ باقی رہ گئیں ان کو "کچھ نثر میں بھی" کے عنوان سے مرتّب کر کے مکتبہ جامعہ

دہلی نے شائع کر دیا۔ اس مجموعے میں ریڈیائی ٹاکس، اردو کانفرنسوں کے خطبے اور نظام خطبات وغیرہ نثری افکار شامل ہیں۔ وہ اپنی نثر نگاری کے بارے میں اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"دراصل میں نے نثر نگاری کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ شاید غیر شعوری طور پر میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ جیسے یہ صلاحیت مجھ میں نہیں۔ شاعری میں تو روایات کی بیساکھی مل جاتی ہے۔ آہنگ کے سہارے کام آتے ہیں لیکن نثر لکھنے والے کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور ساری مسافت اپنے بل بوتے پر طے کرنا پڑتی ہے۔"

ملّا صاحب کا نثری سرمایہ زیادہ نہیں لیکن نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس میں تنقیدی بصیرت کارفرما نظر آتی ہے۔ یہی کیفیت سرشار، چکبست، سراج اور سردار جعفری کے مجموعۂ کلام "پیراہن شرر" پر ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ہم ان تمام تحریروں کو تاثراتی تنقید کہہ سکتے ہیں۔ لسانی فکر کا عنصر بھی ان کی نثری تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔

ملّا صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ممبر ہیں۔ پانچ سال تک نائب صدر رہے اور دس سال تک مسلسل صدر رہے۔ وہ انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ لکھنؤ کے بھی صدر رہے۔ ترقی اردو بورڈ کے وائس چیئرمین رہے، آج کل جامعہ اردو علی گڑھ کے نائب امیر جامعہ ہیں۔ اردو کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں تقسیم ہند کے بعد پیدا ہوئیں ان کے خلاف ملّا صاحب آواز اٹھاتے رہے اور حکومتِ وقت سے برابر اردو کے حق میں لڑتے رہے اور آج بھی اردو کے خلاف کوئی آواز اٹھتی ہے تو ان کی طبیعت بے چین ہو جاتی ہے اور وہ غیر منصفانہ رویّے کی مذمّت کرنے سے نہیں چوکتے۔ اردو کے لسانی مسائل پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے اور وہ کھری بات کہنے میں ذرا بھی تامّل سے کام نہیں لیتے۔ تقریباً نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے اردو کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اردو کے عنوان سے ملّا صاحب کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو جس میں ان کی دلی کیفیت کا پتا چل سکتا ہے۔

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے سنتی اردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

گاندھی جی کا جب قتل ہوا تو ملا صاحب تلملا اُٹھے اور ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لو تھراتی ہے
اتر دکھن، پورب، پچھم، ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوعِ انساں شانوں پہ لیے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

اب آخر میں ملا صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پوچھو نہ سانحاتِ گلستاں کی داستاں
اپنے چمن کو لوٹ لیا خود بہار نے

آشیاں والوں کی اب گلشن میں گنجائش نہیں
آج صحن باغ میں یا صید یا صیاد ہیں

یہ ہمتِ مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے
طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لب عدل
یوں حرف حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے
چنتی رہی شیخ کی داڑھی کے جو تنکے
یہ جراُتِ رندانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مسند پہ پہنچ کر بھی رہا حامیِ جمہور
ملاّ کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

حریف بن کے مقابل میں آسکا نہ جہاں
تو دوست بن کے پسِ پشت آکے رہ گیا

بول میٹھے پیار کے ہونٹوں میں یوں پھنستے ہیں آج
طفل جیسے گھر کے انجانوں میں شرما جائے ہے

کچھ بات ہے ملاّ میں کہ نقادوں کے باوصف
وہ انجمن شعر میں گمنام نہیں ہے

ملاّ صاحب کے یہاں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ وہ انسان کے ذہن کی گہرائیوں میں اس طرح اترتے چلے جاتے ہیں کہ ذہن کی ہر پرت کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مسز سروجنی نائڈو کے انتقال پر انھوں نے جو نظم کہی تھی اس کا ہر بند دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؂

چمن کا موج شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا روحِ گل و یاسمن سلام تجھے
ترے سخن کے سنوارے ہوئے دماغوں کا
تری نظر کے جلائے ہوئے چراغوں کا
تری ہی یاد سے روشن جگر کے داغوں کا
فروغِ گم شدۂ انجمن سلام تجھے

ملاّ صاحب کو اُن کی ادبی خدمات کے صلے میں بہت سے انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ بڑے انعاموں میں بھوپال سے ایک لاکھ روپے کا اقبال سمّان

انعام ملا۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، یو۔پی سے غالب ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ سے اور اسی سال ہریانہ اردو اکیڈمی نے ان کی اردو خدمات پر پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا ہے۔ ملّا صاحب اکتوبر ۱۹۹۵ء میں ۹۴ سال کے ہو جائیں گے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ خدا اُن کو ہمیشہ زندہ اور سلامت رکھے اور ہمارے سروں پر اُن کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔